Registered No. L.4186

ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ — جلد ۱۴ - عدد ۴

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

ملتان روڈ

قیمت سالانہ پانچ روپے — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعد اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	۱۰	۲۵	۴۵	لتہ
نصف صفحہ	۶	۱۵	۲۵	۴۵
ربع صفحہ	۴	۱۰	۱۷	۲۵

۱۔ کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴۔ نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

فہرست مضامین

ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ ۔ مطابق ماہ جون ۱۹۳۹ء جلد ۱۴ ۔ عدد ۴

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۴۲
مقالات :		
اسلامی قانون معیشت	از افادات حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ	۲۵۴
دلائل السنن و الآثار	جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی	۲۶۹
حقیقت نفاق	جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی	۲۸۱
تنزیل و تاویل :		
امثال القرآن	جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری	۲۹۷
رسائل و مسائل :		
بے اصل فتنے	ابوالاعلیٰ مودودی	۳۰۷
مطبوعات ۔	" ص "	۳۲۰

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر، گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن، ملتان روڈ، لاہور سے شائع ہوا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

پچھلی دو اشاعتوں سے ان صفحات میں اس خیال کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے کہ مسلمان دراصل ایک "جماعت" یا "پارٹی" کا نام ہے، اور اس کو مجرد ایک "قوم" سمجھ لینا غلطی ہے۔

یہ نئی آواز اکثر لوگوں کے لیے وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر متعدد اصحاب نے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔ ایک صاحب نے تو بگڑ کر یہاں تک لکھ دیا کہ تم متضاد باتیں کر رہے ہو۔ آج تک تو تم مسلم قوم اور اسلامی قومیت کے تصور کی وکالت کر رہے تھے۔ اب خود اپنے ہی سابق دعوے کی نفی کرنے لگے۔ اب تم کہتے ہو کہ مسلمان قوم نہیں بلکہ پارٹی ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح ایک قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور اپنا الگ مسلک رکھنے کے باوجود سب کی سب اُس بڑے مجموعہ میں شامل رہتی ہیں جس کو "قوم" کہا جاتا ہے، اسی طرح مسلمان بھی ایک پارٹی ہیں اور یہ ہندوستانی قوم کا ایک جزء بن کر رہ سکتے ہیں؟ اگر تمہارا یہی مطلب ہے تو آج تک تم ہندوستانی قوم پرستی کی مخالفت کس بنا پر کر رہے تھے؟

اسی قسم کے خیالات بعض دوسرے لوگوں نے بھی ظاہر کیے ہیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی ہمارے عوام تو درکنار بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اُن باتوں کو سمجھنے کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہیں جو آگے چل کر میں کہنا چاہتا ہوں۔ مدتوں سے جو خود فراموشی ان پر طاری ہے، اور غیر اسلامی حالات کی گیرائی نے جس طرح ان کو اپنے آپ سے اجنبی بنا دیا ہے اس کا طبعی اقتضا یہی ہے کہ خود شناسی (Self-realisation) کی طرف پہلا ہی قدم اٹھانے میں ان کو ذہنی الجھنیں پیش آئیں۔ لہٰذا آئندہ مباحث کو ملتوی کر کے سب سے پہلے میں ان الجھنوں کو صاف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جماعت یا پارٹی کے لفظ کو عام طور پر لوگ سیاسی جماعت یا پولیٹیکل پارٹی کے معنی میں لیتے ہیں۔ اسی معنی سے وہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ لیکن یہ اس لفظ کا اصلی مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک خاص معنی میں بکثرت مستعمل ہونے سے پیدا ہو گیا ہے۔ اصلی مفہوم اس لفظ کا یہ ہے کہ جو لوگ ایک مخصوص عقیدے، نظریے، مسلک اور مقصد پر مجتمع ہوں وہ ایک جماعت ہیں۔ اسی معنی میں قرآن نے "حزب" اور "امت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اور اسی معنی میں "جماعت" کا لفظ احادیث اور آثار میں مستعمل ہوا ہے، اور یہی مفہوم پارٹی کا بھی ہے۔

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیش نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے اس لیے وہ اس قوم کا جزو بنکر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہو۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلّی نظریہ اور جہانی تصور (World theory) لیکر اٹھتی ہے۔ جس کے سامنے تمام نوع انسانی کے لیے (بلا لحاظ قوم و وطن) ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے۔ جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے۔ جس کا نظریہ و مسلک عقائد و افکار اور اصول اخلاق سے لیکر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک، ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ جو ایک مستقل تہذیب اور ایک مخصوص تمدن (Civilization) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ حقیقت میں ایک جماعت ہی ہوتی ہے، لیکن یہ اس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جزو بن کر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا تو مشن ہی یہ ہوتا ہے کہ اُن نسلی و روایتی تعصبات کو توڑ دے جن پر دنیا میں مختلف قومیتیں بنی ہیں، پھر یہ خود اپنے آپ کو کس طرح ان قومیتوں کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (Intellectual

nationality) بناتی ہے۔ جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (Expanding nationality) بناتی ہے۔ یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو عقلی و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر روئے زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ لیکن ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے، کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اُس نظریہ و مسلک کی پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنی ہے۔

مسلمان دراصل اسی دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اُس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں۔ بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظام تہذیب و تمدن (Civilization) بنانے کے لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اس لحاظ سے یقیناً درست ہوگا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبار تمدن یا باعتبار جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریۂ حیات اور فلسفۂ اجتماع (Social philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب و مدنیت کی عمارت الگ بناتی ہے۔ لیکن اس معنی کے لحاظ سے "قوم" ہونے کے باوجود یہ حقیقت میں "جماعت" ہی رہتی ہے کیونکہ محض اتفاقِ پیدائش (Mere accident of birth) کسی شخص کو اس قوم کا ممبر نہیں بنا سکتی جب تک کہ وہ اس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو، اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اس کے لیے اس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔ پس جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اس قوم کی قومیت اس کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بنا پر قائم ہے۔ جماعتی حیثیت جڑ کا حکم رکھتی ہے اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور یہ مجرد ایک قوم بن کر رہ جائے تو یہ اس کا تنزل (Degeneration) ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی (Unique) ہے۔ اسلام سے پہلے بودھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود کو توڑ کر تمام عالم انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ و مسلک کی بنیاد پر عالمگیر برادری بنانے کی کوشش کی۔ مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا فلسفۂ اجتماع نہ تھا جس پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی کلّی نظام بنا سکتے۔ اسلیے یہ دونوں مسلک کوئی عالمگیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک طرح کی برادری (Brotherhood) بنا کر رہ گئے۔ اسلام کے بعد مغرب کی نشأۃ تہذیب اٹھی جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا، مگر اول یوم پیدائش سے اس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا لہٰذا یہ بھی عالمگیر قومیت بنانے میں ناکام ہوئی۔ اب مارکسی اشتراکیت آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدوں کو توڑ کر جہانی تصور کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالمگیر ہو۔ لیکن چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے جو اس کے پیش نظر ہے، اسلیے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالمگیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکی ہے۔ اس وقت تک میدان میں تنہا اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جو نسلی اور تاریخی قومیتوں کو توڑ کر تہذیبی بنیادوں پر ایک عالمگیر قومیت بناتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اسلام کی اسپرٹ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں انکے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اجتماعی ہیئت کس طرح بیک وقت قوم بھی اور پارٹی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا کی جتنی قوموں کو جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے ارکان پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بنتے ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص اٹالین پیدا ہوا ہے وہ اٹالین قومیت کا رکن ہے اور جو اٹالین پیدا نہیں ہوا وہ کسی طرح اٹالین نہیں بن سکتا۔ ایسی کسی قومیت سے وہ واقف نہیں ہیں جس کے اندر آدمی اعتقاد اور مسلک کی بنا پر داخل ہوتا ہو اور اعتقاد و مسلک کے بدل جانے پر اس سے خارج ہو جاتا ہو۔ انکے نزدیک یہ صفت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک پارٹی کی ہو سکتی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نرالی پارٹی اپنی الگ تہذیب بناتی ہے، اپنی مستقل قومیت کا ادعا کرتی ہے اور کسی جگہ بھی مقامی قومیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی تو انکے لیے

یہ معاملہ ایک چیستاں بن کر رہ جاتا ہے۔

یہی نافہمی اب غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں کو بھی پیش آرہی ہے۔ مدتوں سے غیر اسلامی تعلیم و تربیت پاتے رہنے اور غیر اسلامی ماحول میں زندگی گذارنے کی وجہ سے انکے اندر تاریخی قومیت کا جاہلی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ہماری اصل حیثیت ایک ایسی جماعت کی تھی جو دنیا میں عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، جسکی زندگی کا مقصد اپنے نظریہ کو دنیا میں پھیلانا تھا، جس کا کام دنیا کے غلط اجتماعی نظامات کو توڑ پھوڑ کر اپنے فلسفۂ اجتماع کی بنیاد پر ایک عالمگیر اجتماعی نظام مرتب کرنا تھا۔ یہ سب کچھ بھول بھال کر انہوں نے اپنے آپ کو بس اسی قسم کی ایک قوم سمجھ لیا ہے جیسی اور بہت سی قومیں دنیا میں موجود ہیں۔ اب انکی مجلسوں اور انجمنوں میں، انکی کانفرنسوں اور جمعیتوں میں، انکے اخباروں اور رسالوں میں، کہیں بھی انکی اجتماعی زندگی کے اُس مشن کا ذکر نہیں آتا جسکے لیے ان کو دنیا بھر کی قوموں میں سے نکال کر ایک امت بنایا گیا تھا۔ اس مشن کے بجائے اب جو چیز انکی تمام توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے وہ "مسلمانوں کا مفاد" ہے ـــ مسلمانوں سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو مسلمان ماں باپ کی نسل سے پیدا ہوئے ہوں، اور مفاد سے مراد ان نسلی مسلمانوں کا مادّی و سیاسی مفاد ہے یا بدرجۂ آخر اس کلچر کا تحفظ ہے جو ان کو آبائی ورثہ میں ملی ہے ـــ اس مفاد کی حفاظت اور ترقی کے لیے جو تدبیر بھی کارگر ہو اس کی طرف یہ دوڑ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح مسولینی ہر اس طریقہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جو اطالویوں کے مفاد کے لیے مناسب ہو۔ کسی اصول اور نظریہ کا نہ وہ پابند ہے نہ یہ۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ اطالویوں کے لیے مفید ہو وہ حق ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ "مسلمانوں" کے لیے مفید ہو وہ حق ہے۔ یہی چیز ہے جس کو میں مسلمانوں کا تنزل کہتا ہوں، اور اسی تنزل کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ تم نسلی اور تاریخی قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہو بلکہ حقیقت میں ایک جماعت ہو، اور تمہاری نجات صرف اس چیز میں ہے کہ اپنے اندر جماعتی احساس (Party sense) بیدار کرو۔

اس جماعتی احساس کے فقدان یا خود فراموشی کے برے نتائج اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے یہ اسی بے حسی و خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر جگہ مقتدی کی حیثیت سے نظر آرہا ہے۔ گاندھی، جواہر لال، بوس، راے، ایم این رائے، غرض جس نے بھی اپنا جھنڈا بلند کیا، کچھ نہ کچھ مسلمان اسکی طرف ضرور دوڑ گئے۔ گویا مسلمان کی حیثیت سے ان کا نہ کوئی اپنا مشن ہے، نہ کوئی نظریہ، نہ کوئی اصول، بلکہ یہ ہر مشن کی خدمت بجالانے اور ہر نظریہ پر ایمان لانے کے لیے آزاد ہیں۔ انکے لیے کوئی منزل مقصود متعین نہیں۔ جو راہ رو جس منزل کی طرف بھی جارہا ہو یہ اس کے پیچھے جاسکتے ہیں اور مسلمان کا لقب ان کا پیدائشی لقب ہے کہ اسلام کے مشن کو چھوڑ کر یہ خواہ کسی مشن کی خدمت کریں، یہ لقب بہرحال انکے ساتھ چپکا رہیگا۔

اسی خود فراموشی کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جو ماس کانٹیکٹ مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں میں کرنا چاہیے تھا وہ دوسری قومیں خود مسلمانوں میں کرنے کے لیے آتی ہیں اور انکے ساتھ نئی روشنی کے جہلا ہی نہیں بلکہ ہمارے مدارس عربیہ کے محدث اور مفسر اور فقیہ بھی تشریف لاتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا جماعتی احساس مر نہ گیا ہوتا، اور انھیں یاد ہوتا کہ دنیا میں ہماری زندگی کا اصل مشن کیا ہے تو یہ خود اپنے فلسفۂ اجتماع کی بنیاد پر آزادی اور ترقی اور اجتماعی فلاح کا ایک پروگرام بناتے اور اس کو لیکر جمہور اہل ہند کے سامنے جاتے اور ان کو اپنے پروگرام کا حامی بناکر سیاسی طاقت حاصل کرتے اور اس طاقت سے وہ حقیقی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتے جو اسلام چاہتا ہے کہ برپا کیا جائے۔ ہندوستان میں جو سیاسی اور معاشی ظلم ہو رہا ہے، یہاں کے باشندے جن تمدنی خرابیوں میں مبتلا ہیں، یہاں اخلاقی معاشرتی اور سیاسی جمہوریت کے فقدان سے جو برائیاں پیدا ہو رہی ہیں، ان کے علاج کی فکر و تدبیر کرنا دراصل مسلمان کا کام تھا۔ یہ دنیا میں پیدا ہی اسی لیے کیا گیا تھا کہ خدا کے بندوں کو ظلم اور گمراہی سے بچائے اور زمین پر عدل کی حکومت قائم کرے۔ اسی لیے اس کو قرآن دیا گیا تھا۔ اسی لیے اسے دنیا کے سب سے بڑے داعیٔ انقلاب محمد نبی علیہ السلام کی قیادت میں منظم کیا گیا تھا۔

مگر یہ اپنے آپ کو اور اپنے مشن کو اور قرآن و محمدؐ کی ہدایت کو پوری طرح فراموش کر چکا ہے۔ اب اجتماعی فلاح وترقی کے پروگرام بنانا دوسروں کا کام ہے اور اس کا کام صرف یہ ہے کہ یا تو ان کے پروگرام کی تبلیغ کرتا پھرے، یا پھر یہ کہ ان کے فاتحانہ اقدامات کو دیکھ دیکھ کر ڈرے، سہمے، نوحہ کرے، اور اپنا ماتمی مشن لیکر جگہ جگہ روتا پھرے۔

اسی خود فراموشی کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت اور اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اُس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ مردم شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں جو گنتی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں! یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب اس کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں سوجھتی کہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے۔ اس صورت حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو محض ایک قوم سمجھ رہا ہے جسکی قوت کا انحصار زیادہ تر تعداد پر ہوتا ہے۔ اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہرگز اسے کوئی پریشانی پیش نہ آتی۔ اسکے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔ کثرت وقلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ جماعتوں کے لیے نہیں۔ جو جماعتیں کسی طاقت ور نظریہ اور جان دار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد

ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر حکمراں ہوگئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی اسی طرح حکمراں بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ جہاد کے میدان میں اترے اور اپنے جماعتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ عامۂ خلائق کی فلاح و نجات کے لیے سعی کرے، اور اپنے نظریہ و مسلک کو قولاً و عملاً اس طور پر پیش کرے کہ مصیبت زدہ عوام کی ہمدردیاں اس کو حاصل ہو جائیں۔ اسلام کے اصول اس غرض کے لیے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اس پروگرام کو لے کر اگر مسلمان عملی مجاہد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں سیاست کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ ان کو اس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی قوت تسخیر چھپی ہوئی ہے۔ ان کے دماغوں کی پہنچ زیادہ سے زیادہ جہاں تک ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں، یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالہ کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسر اقتدار ہیں ان میں سے کسی جماعت کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز نہیں ہے۔ غالباً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے، مگر اس کے ارکان بھی ۳۲ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ جس نظریہ و مسلک کے حامیوں کی تعداد صرف ایک ملک میں آٹھ کروڑ اور دنیا بھر میں ۴۰ کروڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرۂ زمین پر حکمراں ہو جانا چاہیے۔ یہ نتیجہ یقیناً رونما ہوتا اگر ان لوگوں میں جماعتی احساس بیدار ہوتا، اور انہیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اس مشن کے لیے سعی و جہد پر کمربستہ ہوتے۔ لیکن جس چیز نے اس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر ـــ قطعی ناکارہ بنا دیا ہے وہ اسی احساس و شعور اور اسی آمادگی

عمل کا فقدان ہے۔ مختلف قسم کی شیطانی قوتیں اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ سے واقف نہ ہونے پائے، اور اس کو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آئے کہ یہ اپنی زندگی کے مشکل کا خیال کر سکے۔

اگر آج کوئی شخص امریکہ میں یہ آواز اٹھائے کہ اب سے ۷۰ سال پہلے صدارت جمہوریہ کے منصب پر ابراہیم لنکن کا انتخاب بالکل ناجائز ہوا تھا، اور نیو یارک کی سڑکوں پر "لنکن غاصب تھا" اور "لنکن مردود تھا" کا شور مچاتا پھرے، اور لوگوں کو دعوت دے کہ لنکن کے خلاف ایجی ٹیشن کریں، تو یقین جانیے کہ امریکہ کی دس بارہ کروڑ آبادی بالاتفاق اس کو پاگل قرار دیگی اور اسکی اس صدا کا جواب بجز اسکے اور کچھ نہ ہوگا کہ اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں بھیج دیا جائیگا۔ کوئی قوم جسکی عقل و دانش کا بالکل دیوالہ نہ نکل چکا ہو، اس حماقت کا ارتکاب نہیں کر سکتی کہ اپنی زندگی کے حقیقی مسائل کو چھوڑ کر ان مسائل پر لڑنے جھگڑنے میں اپنا وقت اور اپنی قوت ضائع کرے جنکا تصفیہ قرنوں پہلے واقعات کی دنیا میں ہو چکا ہو اور جن کے بارے میں آج کوئی مخالف یا موافق فیصلہ کرنے سے اسکی زندگی کے معاملات پر کسی قسم کا اچھا یا برا اثر نہ پڑ سکتا ہو۔ لیکن ذرا ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے۔ یہاں ایک مدت سے اس سوال پر جھگڑا اور سخت جھگڑا برپا ہے کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اسلامی حکومت کی صدر نشینی کے لیے ابوبکرؓ و عمرؓ کا جو انتخاب ہوا تھا وہ جائز تھا یا نہیں۔ ہندوستان کے ہر حصے سے سینکڑوں اور ہزاروں آدمی، جاہل نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ، بڑی بڑی اونچی حیثیتیں رکھنے والے، وکیل اور بیرسٹر اور جج، کھنچ کھنچ کر لکھنؤ پہنچ رہے ہیں تاکہ اُس انتخاب کو جو ساتویں صدی عیسوی میں مدینہ میں ہوا تھا بیسویں صدی میں لکھنؤ کی سڑکوں پر باطل ٹھیرائیں! لاکھوں کروڑوں آدمی اس مسئلہ سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ قوم کی ساری توجہات سمٹ کر اس مرکزی سوال پر جمع ہو گئی ہیں۔ وقت کے تمام مسائل اسکے سامنے پس پشت ڈال دیے گئے ہیں۔ دو بڑے گروہ پوری قوت کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما ہیں تاکہ اس مسئلہ کا تصفیہ اپنے حق میں کرائیں۔ اور یہ سب کچھ ہو کس وقت رہا ہے؟ عین اس وقت جبکہ ہندوستان کی نئی قسمت بن رہی ہے اور واقعات کی دنیا میں اصلی تصفیہ طلب سوال یہ نہیں ہے کہ رسولؐ اکرم کے جانشین ابوبکرؓ ہوں یا علیؓ،

بلکہ یہ ہے کہ انگریز جس مسند حکومت کو خالی کر رہا ہے اس پر کون متمکن ہو؟

یہ صرف ایک مثال ہے ان لاطائل جھگڑوں کی جو شیاطین جن و انس نے صرف اس غرض کے لیے برپا کر رکھے ہیں کہ مسلمانوں کا ذہن فضولیات میں الجھا رہے اور انہیں کبھی اُس مقصد کو پورا کرنے کی، بلکہ اس مقصد کو سمجھنے تک کی فرصت بھی میسر نہ آئے جسکے لیے اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تھا اور "مسلم" کے نام سے ایک نئی امت بنائی تھی۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئیگا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کی جان کا لاگو بنا ہوا ہے اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی کچھ دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے اُن مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات سر پھٹول اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جنکی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش انکی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے وہاں کچھ دوسری قسم کے شیاطین نمودار ہوتے ہیں، اور وہ دنیوی ترقی و خوشحالی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد اور طریق کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ان لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے، جس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بہت سے روگ جو اس قوم کو لگے ہوئے ہیں، انہوں نے آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی اس عظیم الشان تعداد کو صفر کے درجے تک گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لیے جہاد اور محنت و جانفشانی چاہتا ہے، یہ اس سے بہت دور ہٹا دیئے گئے ہیں۔ ان کے ذہن سے اسلام کا صحیح تصور اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیے گئے ہیں۔ جو اسلام ان کے

اندر پایا جاتا ہے اُس کے لیے کوئی مستقبل نہیں، کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائیگا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑیگا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو امید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام از سر نو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں حکمرانی و فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے برسرِ آمادہ ہو، تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت ان مسلمانوں کا ایک معتد بہ حصہ زیادہ آسانی سے اور زیادہ جلدی اس تحریک کو قبول کریگا۔

اب جو لوگ حقیقت میں اُس اسلام کو جانتے اور سمجھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اور جنکا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت اسی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل و متوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے، اُن کو چند غلط فہمیاں سے اپنے ذہن کو صاف کر لینا چاہیے اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہییں:

اوّل یہ کہ "مسلمانوں کے مفاد" سے اسلام کا دامن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال ہرگز کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک غیر اسلامی نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے کتنے مسلمانوں کی خدمات فوج میں اور کتنوں کی پولیس میں، اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں، اور کتنی نشستیں انکو مجالس قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ غیر اسلامی اصول پر قانون بنانے میں وہ بھی غیر مسلموں کے ساتھ حصہ دار ہوں اور کن ریاستوں کی مسند حکمرانی مسلمان فرمانرواؤں کے لیے محفوظ رکھی جائے تاکہ وہ غیر اسلامی طرز پر حکومت کرتے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے۔ ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو ان مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے لکھے ہوئے ہیں، اور نہ اسکی کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرت تعداد کوئی مضبوط رکاوٹ ہے۔ مردم

شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے، اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب جتنا زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے، یہ صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اسکے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنیکے لیے ایک عملی پروگرام لے کر کوئی منظم جماعت اٹھ کھڑی ہو، تو یقین رکھیے کہ اس کا اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہیگا بلکہ شائد مسلمانوں سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گا اور کوئی طاقت اس سیل رواں کو نہ روک سکیگی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے افسوس ہے کہ وہ اسلام کے ان امکانات سے ناواقف ہیں۔

تیسرے یہ کہ کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ اس کے حقیقی معتقدوں اور پیرووں کی تعداد ملک میں ۶۰ یا ۷۰ فی صدی ہو جائے۔ تاریخ کے واقعات اور خود موجودہ دنیا کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور منظم پارٹی جس کے ارکان اپنی تحریک پر پورا ایمان رکھتے ہوں، اور اسکی راہ میں جان و مال قربان کرنے کیلیے تیار ہوں، اور پارٹی کے ڈسپلن کی کامل اطاعت کرتے ہوں، محض اپنے ایمان اور ڈسپلن کی طاقت سے برسر اقتدار آسکتی ہے خواہ اسکے ارکان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی ہزار بھی نہ ہو۔ پارٹی کا پروگرام کروڑوں کو اپیل کرتا ہے، اور کروڑوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے۔ مگر خود پارٹی کے اندر صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف کمال درجے پر رکھتے ہوں۔ پس اسلام کو حکمراں بنانے کے لیے مسلمانوں کی کسی بہت بڑی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے ہی کافی ہیں بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے حقیقی مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔

مقالات

اسلامی قانون معیشت

اسکی روح اور اسکے اصول

(۲)

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی)

ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ ابواب ابتغاء الرزق

چند اصولی پابندیاں مذکورۂ بالا حدود کے علاوہ چند اصولی پابندیاں اور ہیں جو تجارتی معاملات پر عائد کی گئی ہیں آگے بڑھنے سے پہلے ایک سرسری نگاہ ان پر بھی ڈال لینی چاہیے:

ناجائز شرطیں باطل ہیں بیع مشروط کے متعلق بعض مخصوص احکام اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں ایک عام اور اصولی بات بیان کر دی جاتی ہے۔ شارع کا فرمان ہے کہ "ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں ہے، باطل ہے"۔ لیکن اس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہر وہ شرط جس کی قرآن میں صریح اور منصوص اجازت موجود نہیں ہے، باطل ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شرط قرآن میں تصریحاً ممنوع قرار دے دی گئی ہے یا جو روح قانون اسلامی کے مخالف ہو، وہ شرط باطل اور ناجائز ہے۔

حقوق ولایت کی بیع ناجائز ہے حقوق ولایت کا بیچنا اور ھبہ کرنا اسلام میں قانوناً ناجائز ہے۔ کیونکہ قابل خرید و فروخت صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو حسی اور مشاہد ہو۔ ولایت کے حقوق کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ وہ تو ایک ذہنی اور اضافی چیز ہے۔ نیز ولایت نسب کے تابع ہے۔ جس طرح نسب کی بیع اور ھبہ جائز نہیں اسی طرح ولایت کی بیع اور اس کا ھبہ

بھی جائز نہیں۔

لین دین میں قسم کھانے کی ممانعت تجارتی کاروبار میں بات بات پر قسم کھانا ایک عام شیوہ سا ہوگیا ہے۔ یہ ایک نہایت ذمیل حرکت ہے۔ اس میں برائی کے دو پہلو ہیں، ایک تو فریق ثانی کو اس کے ذریعہ دھوکا دیا جاتا ہے اور دوسرے اللہ کا نام ایک کھیل بن جاتا ہے اور اس کی حقیقی عظمت کا احساس دلوں سے فنا ہو جاتا ہے۔ اس لیے شارع نے فرمایا ہے کہ الحلف منفقة للسلعة محقة للبركة (تجارت میں قسم کھانا اگر مال کی نکاسی کا ذریعہ ہے تو کمائی میں بے برکتی کا بھی ذریعہ ہے) اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اسلام اپنے پیرودں میں اس مذموم رسم اور عادت کا کوئی ہلکا سا اثر بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا اور حکم دیتا ہے کہ "اے تجارت پیشہ لوگو خرید و فروخت کرتے وقت زبان سے بہت سی فضول باتیں اور ناروا قسمیں نکل جایا کرتی ہیں اس لیے بیع کے ساتھ کچھ صدقہ بھی دیا کرو"۔ صدقہ کا حکم اس لیے دیا گیا تا کہ وہ ان فضول گوئیوں اور غلطیوں کا کفارہ ہو جائے۔

سونے اور چاندی کے سکوں کا مبادلہ اگر کوئی شخص اپنی چیز کو دینار (سونے کے سکے) کے حساب سے بیچتا ہے لیکن دینار کے بجائے دراہم (چاندی کے سکے) لیتا ہے تو قانون اسلام اسے اس کی اجازت دیتا ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ ایک تو یہ کہ دراہم کی قیمت وہی مانی جائے جو اس روز بازار میں تھی۔ دوسری یہ کہ فریقین معاملہ اسی وقت چکتا کریں، یعنی جدا ہونے سے پہلے ان کے درمیان کوئی بات تصفیہ طلب نہ رہ گئی ہو۔ مثلاً اس امر کا تصفیہ کہ کتنے دیناروں کے قائم مقام کتنے درہم ہونگے، صرافوں پر چھوڑ دیا گیا ہو یا اسی قسم کی کوئی اور بات زمانہ مستقبل میں طے ہونے کے لیے اٹھا رکھی گئی ہو۔ اگر ان شرطوں کو پورا نہ کیا جائے تو بائع کو اس کی اجازت نہیں کہ دینار کے بجائے قیمت میں دراہم لے کیونکہ یہ صورت نزاع پیدا کر دینے کا احتمال رکھتی ہے اور اس سے معاملہ صاف اور یکسو نہیں ہونے پاتا۔

ناپ تول میں کمی کی ممانعت ناپ تول میں ڈنڈی مارنے کی سخت ممانعت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے ناپنے تولنے والوں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ "تم دو ایسی چیزوں (ناپنے اور تولنے) کے مختار اور ذمہ دار بنائے گئے ہو

جن کے ذریعہ بہت سی پچھلی قومیں ہلاک ہوگئیں" یعنی ناپنے تولنے میں عدل اور قسط کا پورا پورا لحاظ کرنے کی وجہ سے کتنی ہی قومیں ہلاک ہوچکی ہیں مثلاً قوم شعیب، جس کا عبرتناک حشر قرآن میں لکھا ہوا موجود ہے۔ پس ہر مسلمان کو اس خیانت اور بدمعاملگی سے بچنا چاہیے۔

نرخوں کا حکماً مقرر کیا جانا تجارتی کاروبار میں ایک سوال حکومت کے اختیارات کا آتا ہے کہ آیا وہ اشیاء کی قیمت کا جبری تعین کرسکتی ہے جس کے مطابق بیچنے پر اہل تجارت مجبور ہوں؟ اسلامی قانون تجارت کا رجحان اس طرف ہے کہ تجار اس معاملہ میں آزاد ہیں۔ حکومت کو ان کی آزادی میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک بار لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ تاجروں نے چیزوں کا بھاؤ بہت چڑھا دیا ہے، آپ ان کی قیمتوں کا مناسب تعین فرما دیں۔ آنحضور صلعم نے فرمایا کہ "قیمتوں کا مقرر کرنا اور روزی کا گھٹانا بڑھانا اللہ کے اختیار میں ہے، میں نہیں پسند کرتا کہ میں خدا سے اس حال میں ملوں کہ کسی پر ظلم کرنے کا بار میری گردن پر ہو اور وہ اس کے حضور دادرسی کرے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسا عادلانہ نرخ معین کرنا جو تاجر اور خریدار دونوں کے نفع نقصان کے لحاظ سے بالکل ٹھیک ہو حتیٰ کہ کسی کی ایک ذرہ برابر حق تلفی نہ ہو، تقریباً ناممکن ہے، اسی لیے آنحضور صلعم نے اس کے لیے کوئی حکم صادر کرنے سے اجتناب فرمایا تاکہ آئندہ چل کر امراء اور حکام اس حکم کو اپنے لیے سند نہ بنالیں اور اس کی آڑ میں جب چاہیں اور جس قدر چاہیں چیزوں کی قیمت گھٹا بڑھا دیں۔ تاہم اگر کھلم کھلا تجارت پیشہ لوگ لوٹ ہی پر اتر آئیں اور چیزوں کو بہت گراں کرکے لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کردیں تو حکومت کے لیے جائز ہے کہ رفاہِ عام اور مصالح تمدن کے پیش نظر انہیں اس خود غرضانہ لوٹ کھسوٹ سے باز رکھ کر چیزوں کی قیمتیں متعین کردے۔

احکام بیع اب تک جو اصول ہم نے بیان کیے ہیں ان کا تعلق اسلامی قانون تجارت کے سلبی پہلو سے تھا۔ یعنی یہ کہ تلاش معاش کی جدوجہد میں لوگوں کو کن کن تجارتی طریقوں سے بچنا چاہیے۔ اب ہم اس قانون کے اثباتی پہلو پر ایک اجمالی گفتگو کرکے بتائیں گے کہ شارع علیہ السلام نے مختلف موقعوں پر تجارتی معاملات

میں کیا ہدایات فرمائی ہیں۔

(۱) اگر کوئی شخص درخت خریدے اور اس پر پھل بھی لگے ہوئے ہوں تو وہ پھل بیع میں شامل نہ سمجھے جائینگے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اگر کوئی شخص کھجور کا درخت خریدے تو اس پر لگی ہوئی کھجوریں معاملہ بیع میں شامل نہ ہونگی بلکہ وہ بیچنے والے کی ملک باقی جائینگی الّا یہ کہ درخت خریدتے وقت اس نے ان کھجوروں کو بھی معاملہ بیع میں محسوب کرنے کی تصریح کردی ہو" کیونکہ اصلاً معاملہ تو اس درخت کا ہو رہا ہے اور یہ پھل اس سے ایک زائد چیز ہے جو خریدار کی ملک میں آنے سے پہلے درخت پر لگی تھی، لہٰذا اس کی حثیت اس مال و اسباب کی سی ہے جو کسی گھر کے صحن میں پڑا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ صحیح یا گھر کی خرید و فروخت کا اثر اس مال پر کچھ نہیں پڑ سکتا۔

اس سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ اصل کی بیع میں فرع شامل نہ ہوگی جب تک کہ فرع کے متعلق معاملہ میں تصریح نہ ہو۔

(۲) اگر کوئی شخص کسی چیز کو خریدتا ہے اور کچھ روز کے بعد اس کے کسی عیب پر مطلع ہو کر واپس کر دیتا ہے تو اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مدت میں جو نفع اس نے اس چیز سے اٹھایا ہے، مثلاً اگر مکان تھا تو اس کا کرایہ وصول کیا ہے، اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہونا چاہیے۔ آیا اس چیز کے ساتھ وہ نفع بھی اصل مالک کو لوٹانا چاہیے یا نہیں؟ اسلام نے اس باب میں یہ اصول مقرر کیا ہے کہ "الخراج بالضمان" (یعنی نفع اسی کا ہے جو نقصان کا ذمہ دار ہو) اس قاعدہ کی رو سے نفع کا مستحق خریدار ہے کیونکہ وہ اس چیز کا اس مدت میں ضامن رہا ہے۔ اگر وہ چیز اس کے قبضہ کے زمانہ میں ضائع ہو گئی ہوتی تو وہی نقصان اٹھاتا، لہٰذا جب اس کے نقصان رساں پہلو کا ذمہ دار ہے تو منفعت بخش پہلو بھی اسی کے حق میں ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں اگر بائع کو اس نفع کا حقدار ٹھیرایا جائے تو فریقین کے درمیان نفع کی کمی و زیادتی پر جھگڑا پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے لہٰذا قطع نزاع کے لیے بھی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس حق کا حقدار خریدار ہی کو قرار دیا جائے

اس میں اصولی بات یہ ہے کہ "نفع کا تعلق ہمیشہ نقصان کی ذمہ داری کے ساتھ رہے گا۔"

(۳) "اگر فریقین (بائع اور مشتری) میں باہم کسی بات پر اختلاف پیدا ہو جائے اور شے فروختنی قائم اور اپنی اصلی حالت پر موجود ہو اور کسی فریق کے پاس اپنے دعوی پر کوئی دلیل نہ ہو تو ایسی صورت میں بائع کی بات مانی جائیگی الا آنکہ دونوں کسی نقطہ پر مجتمع ہو جائیں"۔ یہ شارع کا مقرر کیا ہوا اصول ہے۔ جس کے ذریعے اس نے جھگڑے کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس قاعدہ کی بنا اس پر ہے کہ "کوئی چیز اپنے مالک کے قبضہ سے صرف اسی صورت میں نکل سکتی ہے جب کہ فریقین کی باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ بیع طے ہو جائے"۔ اب چونکہ یہاں یہ صورت حال نہیں پائی گئی اور رضا کے بجائے آپس میں اختلاف رونما ہو چکا ہے اس لیے معاملہ کو ختم سمجھ کر مندرجہ بالا اصل کی طرف رجوع کرنا ضروری ٹھیرا یعنی وہ چیز بائع کی سمجھی جائیگی اور اس کی قیمت وہی مانی جائیگی جو بائع کہتا ہے۔ ہاں خریدار کو البتہ یہ اختیار ہے کہ اس قیمت پر چاہے چیز لے یا نہ لے۔ کیونکہ معاملہ بیع کے انعقاد کے لیے جس طرح فریق اول (بائع) کی رضا شرط ہے اسی طرح فریق ثانی (خریدار) کی بھی شرط ہے۔

(۴) اگر کوئی شخص بیع سلم کے طور پر کوئی چیز خریدے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس چیز کی مقدار اور قبضہ کرنے کے وقت کی تعیین کر دے۔ رسول اللہ صلعم جب مدینہ تشریف لائے تو لوگوں میں اس طرح کی بیع کا بڑا رواج تھا۔ لوگ روپیہ پیشگی دیدیتے اور دو دو تین تین سال بعد پیدا ہونے والے پھلوں کو خرید لیتے۔ آپ نے اسے بالکلیہ ممنوع تو نہیں کیا البتہ اتنی شرط لگادی کہ اس چیز کی مقدار یا وزن متعین ہو۔ نیز یہ صاف صاف طے ہو جائے کہ بائع کس وقت خریدار کو وہ چیز دے گا۔

(۵) قرض کے بین دین میں تحریری دستاویز اور شہادت کی سخت تاکید ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ الآية	اے ایمان لانے والو جب تم کسی مدت معین تک کے لیے ایک دوسرے سے قرض لو تو اسے لکھ لیا کرو۔

قرض کا معاملہ معاشی امور میں گوناگوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے - ایک طرف معاشی ضروریات کے پیش نظر قرض کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں، دوسری طرف یہ دیگر معاملات کی بہ نسبت بہت زیادہ نزاع آفریں اور خصومت انگیز ہے - اسی اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ قرض کے معاملات پر گواہ بنانے اور انھیں ضبطِ تحریر میں لانے کی سخت تاکید فرمائی ہے اور کتمان شہادت کی سخت ممانعت کر دی ہے - پھر اسی ضمن میں نیز انھیں معاشی ضرورتوں کے باعث رھن اور کفالۃ وغیرہ معاملات کی بھی اجازت دے دی ہے -

مضاربت یا شرکت کے معاملات اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ نسل انسانی مدنی الطبع واقع ہوئی ہے اور اس کا معاشی سوال اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے افراد میں باہم تعاون نہ موجود ہو - چنانچہ تاریخ تمدن بتلاتی ہے کہ یہ معاشی تعاون مختلف شکلوں میں قوموں کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے - اس تعاون اور اشتراک کی مندرجہ ذیل قسمیں ہو سکتی ہیں:

(۱) دو آدمی کوئی تجارتی کاروبار اس طرح پر شروع کریں کہ ایک کا سرمایہ ہو اور دوسرے کی محنت اور منافع حسب معاہدہ دونوں تقسیم کر لیں - اسے اصطلاح میں "مضاربت" کہتے ہیں -

(۲) دو آدمی مل کر اس طرح تجارت کریں کہ سرمایہ میں دونوں برابر کے شریک ہوں، ہر ایک جو کچھ بیچے یا خریدے دوسرا بھی اس میں شریک ہو، حتیٰ کہ دونوں ایک دوسرے کے ضامن اور ایک دوسرے کے مختار عام ہوں اور بیوپار میں جو نفع ہو اسے دونوں آپس میں بحصۂ مساوی تقسیم کر لیں - اس کا نام "شرکت مفاوضہ" ہے -

(۳) دو آدمی کسی معین سرمایہ سے تجارت کریں جس میں دونوں کے حصے برابر ہوں اور ہر ایک اس سرمایہ کی حد تک خرید و فروخت میں دوسرے کا قائم مقام ہو - لیکن ایک دوسرے کا ضامن اور کفیل علم نہ ہو کر محض شریک کار رہنے کی وجہ سے جو کچھ ایک پر بار ہو وہ دوسرے سے طلب کیا جا سکے - "اسے شرکت عنان" کہتے ہیں -

(۴) دو آدمی اس طرح تجارت شروع کریں کہ سرمایہ کسی ایک کا بھی نہ ہو بلکہ ہر ایک محض اپنی ذاتی شخصیت سے کام لیکر بازار سے ادھار مال حاصل کرے اور دونوں مل کر اسے بیچیں اور قرض ادا کرنے کے بعد نفع باہم تقسیم کریں اس کا نام اصطلاح شرع میں "شرکت وجوہ" ہے۔

(۵) ایک شخص اپنے لیے نہیں بلکہ کسی دوسرے کے لیے معاملات کرے۔ اسے "وکالت" کہتے ہیں۔

(۶) دو صنعت پیشہ آدمی مل کر کام کریں اور جو کچھ حاصل ہو آپس میں بانٹ لیں۔ یہ "شرکت عمل ہے"

(۷) ایک شخص کے باغ کی دیکھ بھال اور آبپاشی دوسرا آدمی کرے اور اس باغ سے جو پھل پیدا ہوں وہ ان میں سے حصہ بٹائے۔ اسے آئین اسلامی میں "مساقاۃ" کہتے ہیں۔

(۸) زمین اور بیج ایک آدمی کا ہو اور ہل بیل نیز کاشت کرنے کی جملہ محنت دوسرے آدمی کی۔ اس طرح جو غلہ پیدا ہو اس میں دونوں شریک ہوں۔ اس کا نام "مزارعۃ" ہے۔

(۹) ایک شخص کی محض زمین ہو اور بیج، ہل اور بیل اور محنت سب دوسرے کی ہو۔ اسے "مخابرہ" کہتے ہیں اور یہ دراصل مزارعۃ ہی کی ایک قسم ہے۔

(۱۰) مزارعت ہی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ زمین، بیج اور ہل اور بیل سب کچھ ایک ہی آدمی کا ہو اور دوسرے کی صرف محنت ہو۔

معاشی تعاون اور اشتراک عمل کی یہ تمام صورتیں اور اسی نوعیت کی دوسری صورتیں بھی اسلام میں جائز ہیں، اور ان کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ فریقین میں جو شرائط طے ہو جائیں ان کی پوری پابندی کی جائے، بجز ایسے معاہدہ اور ایسی شرائط کے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے والی ہوں۔

معاملات میں فضل اور فیاضی یہاں تک جو اصولی قوانین بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق معاشی معاملات میں خود غرضی، ظلم، عدوان اور نزاع کی روک تھام سے تھا۔ لیکن اسلام نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس نے معاشی معاملات میں فضل، فراخ دلی، فیاضی، ایثار اور امداد باہمی کی روح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور احسان و تبرّع کو بھی معاشیات

کا اہم ترین جزو بنادیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے شارع کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو:

رحم اللہ رجلا سمحا اذا باع واذا اشتریٰ واذا اقتضیٰ

اللہ کی رحمت ہو اس شخص پر جو خریدتے اور بیچتے اور قرض کا تقاضا کرتے وقت مروت اور خوش خلقی سے کام لے۔

کج خلقی اور خود غرضی و بے مروتی کاروباری ذہنیت کا گویا ایک فطری خاصہ ہے لیکن چونکہ ایک طرف تاجر کے نفس پر اس کے برے اثرات پڑتے ہیں، دوسری طرف نظام تمدن کے حق میں یہ موت سے کم نہیں، کیونکہ یہ چیز تعاون کی دشمن ہے اور تعاون ہی پر مدنیت کا دارومدار ہے، اس لیے رسول اللہ صلعم نے انتہائی مؤثر طریقہ پر اس سے روک کر سماحت اور فراخدلی کی ترغیب دی ہے۔

اسی مقصد کے لیے ایک موقع پر آپ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "جو شخص کسی ایسی بیع کو جسے اس کا بھائی (خریدار) ناپسند کرتا اور فسخ کرنا چاہتا ہو، فسخ کر دے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو فسخ (یعنی معاف) کر دے گا" معاملہ کی بات تو یہ ہے کہ جب خریدار نے اپنی رضا و رغبت سے ایک چیز خرید لی ہے تو خواہ بعد میں وہ کتنا ہی پچتائے اور اسے واپس کرنا چاہے، بائع واپس کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ایک بھائی کو اس سے نقصان پہنچ رہا ہے اس لیے آنحضرت صلعم نے بیع کو فسخ کرنے کی ان الفاظ میں اپیل فرمائی اور اسے رحمت و مغفرت ایزدی کا ذریعہ بتلایا۔ (بشرطیکہ چیز اپنی اصلی حالت میں ہو)

اگر دو قریبی رشتہ دار ایک ہی شخص کی ملکیت میں ہوں تو اس کے لیے جائز نہیں کہ ایک کو بیچ دے اور دوسرے کو اپنے پاس رکھ چھوڑے۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایسا کیا تھا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ بیع کو فسخ کر کے غلام کو واپس لے لو۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ "جو شخص ماں اور اس کے بیٹے کو الگ الگ کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اور اس کے احباب و اقارب کو الگ الگ کر دے گا"۔ یہاں بھی وہی اصول اخلاق و سماحت کام کر رہا ہے۔

اسی احسان اور تبرع کی تعلیم دیتے ہوئے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی خریدار قیمت ادا کرنے سے پیشتر مفلس ہو جائے اور قیمت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو بائع کو چاہیے کہ اپنی چیز کو واپس لے لے اور اسے قیمت ادا کرنے پر مجبور نہ کرے" اسی طرح آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "اگر قرض دار تنگ دست ہو جائے تو قرض خواہ کو اپنا قرض معاف کر دینا چاہیے یا کم از کم مطالبہ میں نرمی برتنے اور اسے ادا کرنے کی کافی مہلت دے اللہ تعالیٰ اس کو روز جزا کے اہوال سے محفوظ رکھے گا۔"

اس کے برعکس اگر قرض دار قرض ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور پھر قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہو تو دوسروں کو چاہیے کہ اس پر دباؤ ڈال کر حساب بیباق کرائیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "توانگر کا ادائیگی قرض میں لیت ولعل کرنا ظلم و ناانصافی ہے۔ ہاں اگر قرض دار کسی دوسرے شخص کا حوالہ دے تو اس کا حوالہ قبول کر لینا چاہیے" اس دوسرے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اگر قرض دار کا روپیہ کسی دوسرے پر آتا ہو اور وہ قرض خواہ سے کہے کہ تم اس سے وصول کر لو، تو ایسی صورت میں قرض خواہ کو یہ اصرار نہ کرنا چاہیے کہ میں تو تجھی سے وصول کروں گا۔

اسی تبرع کی خاطر قرآن نے مسلمانوں کو بار بار صدقات پر ابھارا ہے اور حکم دیا ہے کہ جو مال اللہ نے انھیں دیا ہے اس میں سے اپنے غریب اور نادار بھائیوں پر بھی خرچ کریں، اور اس کے عوض رضائے الٰہی کے ماسوا کوئی معاوضہ ان کے پیش نظر نہ ہو۔ پھر ایک ایک چیز کو گنا کر بتا دیا کہ ان صدقات کو ان کے صحیح مصارف میں خرچ کرنا ضروری ہے۔ وہ مصارف یہ ہیں:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ الخ۔ (توبہ - ۸)	صدقات تو محض فقیروں، مسکینوں، محصلین زکوٰۃ، کمزور ایمان والے نومسلموں (جن کی تالیف قلب کی ضرورت ہو) اور غلاموں، قرضداروں، راہ خدا میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے ہیں۔

لیکن صدقات کے ذریعہ سے صرف غربا اور حاجت مندوں ہی کے ساتھ احسان اور مواساۃ کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔ کھاتے پیتے مسلمانوں کے ساتھ اظہار اخوت و مواساۃ کا ذریعہ وہ نہیں بن سکتے۔ اس لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے شارع نے ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کی تلقین کرکے ہر امیر اور غریب کے ساتھ رشتۂ اخوت و مودّت کو مضبوط کرنے کی ترغیب دی۔ رسول اللہ صلعم کا فرمان ہے کہ تھادوا فان الھدیۃ تذھب الضغائن (ایک دوسرے کے یہاں ہدیئے بھیجو، کیونکہ ہدیہ دلوں کو کینوں سے صاف کرتا ہے) اور یہ ایک امر واقعہ ہے ہدیہ خواہ کتنا ہی قلیل اور ادنیٰ درجہ کا کیوں نہ ہو لیکن وہ اس بات کی علامت ہے کہ ہدیہ بھیجنے والا اپنے دل میں اسکی جگہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر شارع نے ہدیہ واپس کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق یہ ہے کہ صدقہ محض لوجہ اللہ ہوتا ہے اور ہدیہ دیگر اس شخص کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔ اور یہ چیز بھی انسانیت اور مصالح تمدن دونوں کے لیے اکسیر حیات کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے سوسائٹی کے افراد میں الفت اور اتحاد کی زبردست اسپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جس شخص کے پاس ہدیہ آئے، اگر وہ صاحب استطاعت ہے تو چاہیے کہ وہ بھی اس کا جواب دے اور اگر استطاعت نہیں رکھتا تو ہدیہ دینے والے کے حق میں خیر و تحسین کے کلمات کہدے۔ ایسا کرنا گویا اس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرنا ہو جائیگا۔ لیکن جس نے یہ بھی نہ کیا اس نے سخت ناشکری کی۔ اور جس نے ہدیہ دینے میں اپنی حیثیت سے بہت بڑھ چڑھ کر نمائش کی اسکی مثال اس ریاکار رند کی سی ہے جس نے سر سے پیر تک خرقۂ زہاد پہن رکھا ہو۔"

ہدیہ کے جواب میں ہدیہ بھیجنے میں ایک تو یہ مصلحت ہے کہ اس طرح دونوں جانب سے قربت و الفت کی پیش کش ہوگی جو ہدیہ کا مقصد وحید ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اوپر کا ہاتھ بہرحال نیچے کے ہاتھ سے افضل ہے اس لیے انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا ہاتھ نیچا نہ رہ جائے۔ لیکن اگر واقعی وہ اسکی قدرت نہیں رکھتا تو کم

سے کم اسے اچھے کلمات سے یاد ہی کرے کہ یہ چیز بھی انجام کے لحاظ سے ہدیہ دینے کے برابر ہی ہے۔ لیکن اچھے کلمات سے یاد کرنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ بیٹھے کرنا اور تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دے۔ اس کا معتدل طریقہ بھی شریعت نے متعین فرما دیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "جس شخص پر کوئی احسان کیا گیا ہو اور وہ اپنے محسن کو جزاک اللہ خیرا کہہ دے تو اس نے تحسین و ثنا کا زیادہ سے زیادہ حق ادا کر دیا" شریعت کا مقرر کیا ہوا یہ طریقۂ اظہار تشکر اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے اندر انتہائی مناسبت، جامعیت اور اعتدال رکھتا ہے اس پر اضافہ کرنا جس طرح تملق اور دنائت کی دلیل ہے اسی طرح اس میں بھی بخل کرنا انتہائی بداخلاقی اور کفران نعمت ہے۔

ہدیہ دے کر واپس لے لینا نہایت ہی ذلیل اور مکروہ حرکت ہے۔ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ "کسی چیز کو ہبہ کر کے پھر اسے واپس لے لینے والے کی مثال اس کتے کی سی ہے جو قے کر کے اسے چاٹے، ہم (مسلمانوں) کو ایسی بری حرکت زیب نہیں دیتی"۔ غور کرو یہ مثال کس قدر مبنی بر حقیقت ہے۔ جب ایک شخص اپنی مرضی سے اپنے مال کا ایک حصہ کسی کو ہبہ کر دیتا ہے اور پھر اسے لوٹانا چاہتا ہے، تو آخر کونسی چیز اسے اس فعل پر آمادہ کر رہی ہے؟ ظاہر ہے یا تو وہ انتہائی تنگ دل اور خسیس ہو گا اور کسی اتفاقی جذبہ سے متاثر ہو کر ایک چیز ہبہ کرنے کے بعد اسے اپنی حرکت پر افسوس آیا ہو گا اور اب اسے واپس مانگ رہا ہے، یا اس شخص کو، جسے اس نے ہبہ کیا تھا، تنگ کرنا اور اسے نقصان پہنچانا مقصود ہو گا۔ ان دونوں وجوہ میں سے خواہ کوئی وجہ بھی ہو ہر ایک کا منشا اور منبع بداخلاقی اور خست ہی ہے۔ علاوہ ازیں معاشرتی مصالح کے حق میں ہدیہ دینا اتنا مفید نہیں جتنا اس کا واپس لینا ان کے حق میں مضر ہے۔ اس سے اس شخص کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ اسے اپنی سخت ہتک تصور کرے گا اور اس تصور سے اس کا مشتعل ہو جانا بلکہ انتقام پر اتر آنا یقینی ہے۔ اسی اندیشہ اور خطرہ کی وجہ سے کسی شخص کے لیے ــــ اگر اس کے کئی بیٹے ہوں ــــ جائز نہیں کہ ایک لڑکے کو کوئی چیز ہبہ کرے اور دوسروں کو یونہی چھوڑ دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو گویا

سگے بھائیوں کو باہم دشمن بنا تا ہے۔

وصیت | وصیت کا رواج ہر ملک اور قوم میں رہا ہے۔ اہلِ اسلام کو بھی اسکی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن چند قانونی پابندیوں کے ساتھ۔

(۱) آدمی اپنے کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا۔ حدیث میں آتا ہے کہ لا وصیة لوارث (وارث کے لیے وصیت نہیں ہے) اور اس کے ساتھ ہی اس کی علت بھی بیان فرمادی گئی ہے ان اللہ اعطی لکل ذی حق حقہ (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار یعنی وارث کا حق خود ہی متعین کر دیا ہے)۔ اہل جاہلیت وصیت کے بارے میں بڑی ہی افراط و تفریط سے کام لیتے تھے۔ وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر حق اور مصلحت کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوڑ دیتے اور واقعی حقدار کو اس کے حق سے محروم کر کے دور کے لوگوں کے لیے سارا مال وصیت کر جاتے۔ اس کم بینی اور ناحق شناسی کا دروازہ بند کرنا ضروری تھا۔ پھر اس کی جگہ ایک متوسط اور متوازن اور مصالح تمدن سے موافق طریقہ متعین کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ وصیت کا زیادہ مستحق ان متعلقین کو ٹھیرایا جائے جو رحمی رشتہ رکھتے ہوں بمقابلہ ان لوگوں کے جو محض عارضی اسباب کی وجہ سے قریب ہو گئے ہوں۔ لیکن جب قرآن نے میراث کے مفصل اور متعین احکام نازل فرما دیے اور ہر ایک وارث کا حصہ یہ کہکر متعین کر دیا کہ "یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود ہیں ان میں کمی بیشی نہ ہونے پائے، اللہ نے میراث کی اس تقسیم میں معاشرت اور تمدن اور قرابت کے جن مصالح اور حِکَم کو مرعی رکھا ہے ان کی کنہ تک تمہاری نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں"۔ تو پھر کسی وارث کے حق میں وصیت کا کوئی موقع ہی نہیں رہا ورنہ خدا کی حدود ٹوٹ کر رہینگی وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ نیز اس سے یہ بھی خطرہ ہے کہ وارثوں کے درمیان بغض اور عداوت کا ایک خوفناک جذبہ پیدا ہو جائے گا کیونکہ ہر وارث چاہتا ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ شریعت نے میراث کا قانون منضبط کر کے ان کی ان متصادم خواہشوں کے مفاسد کا سدِ باب کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے ایک خاص رشتہ دار کے حق میں وصیت کرتا ہے تو گویا دوسرے ورثہ کو اس کے خلاف نفرت اور بغض و حسد پر ابھارتا ہے۔

(۲) وارثوں کے لیے کم از کم دو تہائی مال چھوڑنا ضروری ہے۔ وصیت کرنے والے کو زیادہ سے زیادہ اپنے مال کا ایک تہائی حصہ وصیت کے ذریعہ سے غیر وارث لوگوں کو دینے کا حق دیا گیا ہے۔ سعدؓ بن ابی وقاص نے ایک مرتبہ بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ میں بہت بڑی دولت کا مالک ہوں، صرف ایک لڑکی ہے جس کے علاوہ اور کوئی میرا وارث نہیں، تو میں کسقدر مال کی وصیت کرسکتا ہوں؟ کیا تمام مال کی یا نصف کی یا ثلث کی؟ آنحضرت صلعم نے فرمایا "ایک تہائی کی وصیت کرو اور وہ بہت ہے تمہارا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑ جانا اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں اس حال میں چھوڑو کہ وہ لوگوں پر بار رہوں"۔

مال متروکہ کے اصل وارث اور مستحق تو فطرتاً اور رواجاً اس کے قریبی رشتہ دار ہیں، اگر وہ دوسروں کے لیے اپنے مال کی وصیت کرجاتا ہے تو اقربا کی کتنی بڑی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خود حکمتِ تمدن کا مقتضی ہے کہ مرنے کے بعد میت کا ترکہ وہی لوگ پائیں جو دنیا میں اس کے سب سے زیادہ قریب، سب سے زیادہ خیر سگال، سب سے زیادہ ہمدرد اور مددگار تھے۔ اور ان باتوں میں باپ بیٹے وغیرہ جیسے ذوی الارحام سے بڑھکر اور کون ہو سکتا ہے چنانچہ اسی لیے قرآن میں آتا ہے کہ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ (اللہ کی کتاب یعنی قانون میں رحمی رشتہ رکھنے والے ایک دوسرے کے زیادہ قریبی اور ریگانہ ہیں۔) اس لحاظ سے تو تمام ترکہ ورثہ ہی کو ملنا چاہیے۔ مگر معلم حکمت کی نگاہ حقیقت بیں وقتی اور خارجی مصالح کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتی تھی۔ فرض کرو کسی کی تربیت میں کوئی یتیم بچہ ہے، یا کسی کے ایسے غریب رشتہ دار ہیں جنہیں از روئے قانون وارثت نہیں پہنچتی۔ کیا وجہ ہے کہ ان کی مدد کا دروازہ بند کردیا جائے؟ اسی طرح اگر کوئی دولتمند آدمی اپنے چھوڑے ہوئے مال میں سے ایک حصہ رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کرنا چاہتا ہو تو کیوں اس کو ایسے نیک کام سے روکا جائے؟ پس شریعت میں دونوں پہلوؤں کے درمیان پورا توازن قائم کیا گیا ہے۔ نہ جائز حق دار اپنے حق سے محروم کیے جاسکتے ہیں، اور نہ فضل و احسان ہی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

(۳) وصیت کرنے والے کو چاہیے کہ آخری وقت کا انتظار نہ کرے بلکہ وصیت لکھ کر محفوظ کردے۔

حدیث میں مذکور ہے کہ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایک رات اس حال میں گذار دے کہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو اور وہ وصیت اس نے لکھ نہ دی ہو۔ اس حکم کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ صبح تک وہ اس دنیا میں نہ رہے اور جن مصالح اور مقاصد کے لیے اس نے وصیت کا ارادہ کیا ہے وہ فوت ہو جائیں۔[1]

وقف تبرعات ہی کی ایک قسم وقف بھی ہے۔ اب تک تعاون و تبرع کی جتنی صورتیں بیان ہو چکی ہیں وہ سب کی سب کسی نہ کسی شکل میں قبل اسلام بھی رائج تھیں۔ لیکن وقف کا طریقہ بالکل نامعلوم تھا۔ یہ شارع اسلام علیہ السلام کا مخصوص اجتہاد ہے، جس کے اندر نظام معیشت و معاشرت کے ایسے مصالح پوشیدہ ہیں جو دیگر اقسام صدقات و تبرعات سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک شخص خواہ کتنا ہی بڑا فراخ دل ہو، فقراء و مساکین کے

---

[1] ترجمان القرآن۔ اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۔	جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس نے اپنے والدین اور اقرباء کے لیے اچھا خاصا مال چھوڑا ہو تو اس پر فرض کیا گیا ہے کہ احسان کے طور پر اس مال میں سے کچھ وصیت کرے۔ یہ حق ہے پرہیزگاروں پر۔

اس آیت میں خیر (یعنی اچھے خاصے مال) سے مراد اتنا زیادہ مال ہے جس میں سے تمام وارثوں کو کافی حصہ پہنچنے کے باوجود ایک معتدبہ حصہ بچ سکتا ہو۔ مال کم ہونے کی صورت میں وصیت نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے ایک عزیز کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ انہوں نے پوچھا "کیا میں وصیت کروں"؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ "اللہ تعالیٰ نے اِن ترك خيرًا کی شرط لگائی ہے۔ تم کچھ بہت مال تو رکھتے ہی نہیں تھوڑا سا مال ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے چھوڑ دو"۔ البتہ مال زیادہ ہونے کی صورت میں بعض کے نزدیک مستحب اور بعض کے نزدیک واجب ہے کہ ایک حصہ (جو ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو) کسی کار خیر میں صرف کرنے کے لیے وصیت کر دی جائے۔ اور آیت کے الفاظ ان لوگوں کے قول کی تائید کرتے ہیں جو وصیت کو واجب قرار دیتے ہیں (کتب علیکم۔ اور حقًا علی المتقین)۔ ابن عباس اور حسن بصری اور بعض دوسرے اکابر صحابہ و تابعین وجوب ہی کے قائل ہیں۔

لیے صدقہ کردے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک مدت مخصوص کے بعد وہ فرو ختم ہو جائیگا اور ان فقراء کے بعد جو حاجت مند ہونگے وہ اس صدقہ عامہ سے کوئی حصہ نہ پاسکیں گے۔ پس مقاصد کے کمال حصول اور رفاہِ خلق کی عمومیت کے لحاظ سے صدقہ کی اس شکل سے بہتر کوئی شکل نہیں ہوسکتی کہ کوئی مال یا جائداد غربا و مساکین اور دیگر حاجت مندوں کے حق میں اس طور پر بخش دی جائے کہ اصل ہمیشہ اپنی حالت پر باقی رہے، اس میں سے کچھ بھی خرچ نہ ہو اور محض اس کے منافع سے حاجت مندوں کی حاجت روائی ہوتی رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آنحضرتؐ نے ان الفاظ میں وقف کی اجازت مرحمت فرمائی تھی:

ان شئت حبست اصلہا — اگر تم چاہو تو اس (مال یا جائداد) کی اصل روک لو

وتصدقت بہا — اور اس کا (یعنی اس کے منافع) کا صدقہ کردو۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے یونہی کیا اور اس جائداد کو اس شرط پر وقف کر دیا کہ نہ تو وہ بیچی جاسکے گی نہ ہبہ کی جاسکے گی نہ اس میں میراث جاری ہوگی، بلکہ محض اس کے منافع فقیروں (حاجت مند) قرابت داروں، غلاموں، مسافروں اور مہمانوں اور دیگر شرعی ضروریات پر خرچ کیے جائیں گے۔ اس کا متولی اگر حسب دستور اس کی آمدنی میں سے خود بھی کچھ اپنے لیے لے لیا کرے تو اس کے لیے جائز ہے۔

دلائل السنن و الآثار

(۵)

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

ارباب جرح و تعدیل کے طبقات جرح و تعدیل کے باب میں اس سے پہلے تنبیہ کی جاچکی ہے کہ محض ایک دو کتابوں سے جرح یا تعدیل کے الفاظ نقل کر دینا کسی راوی کی روایت کو رد یا قبول کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ صحیح رائے قائم کرنے کے لیے ائمۂ فن کی اصطلاحات اور ان کے اصول اور ان کے طبقات سے واقف ہونا ضروری ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک راوی کے متعلق مختلف ارباب فن کی آرا معلوم کی جائیں اور ان کے درمیان موازنہ کیا جائے۔

ائمہ جرح و تعدیل کی مختلف قسمیں ہیں (۱) جنھوں نے تمام روایات پر کلام کیا ہے جیسے ابن معین و ابن حاتم (۲) جنھوں نے اکثر پر گفتگو کی ہے جیسے امام مالکؒ و شعبہ (۳) جنھوں نے کسی کسی پر کلام کیا ہے جیسے ابن عیینہ و امام شافعیؒ۔

پھر ان تمام کی تین قسمیں ہیں (۱) وہ لوگ جنھوں نے تعدیل میں سخت شرائط کو ملحوظ رکھا (۲) وہ لوگ جنھوں نے ذرا تساہل سے کام لیا (۳) وہ حضرات جنھوں نے میانہ روی اختیار کی۔

قسم اول کے لوگوں نے اثبات تعدیل میں تشدد و افراط برتا اور راوی سے دو تین غلطیوں کے صادر ہونے پر سخت گرفت سے کام لیا ہے لہٰذا اگر اس گروہ کا کوئی شخص کسی راوی کی تضعیف کر دے تو اس معاملہ میں غور کیا جائیگا کہ آیا کسی اور نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے یا نہیں؟ اگر ناقدین فن میں سے کسی نے اتفاق کیا ہے تو

وضعیف ہے، اور اگر کسی نے اس راوی کی توثیق کردی ہے تو بحث ونظر سے کام لیا جائیگا۔ اور محدثین نے یہ جو کہا ہے کہ لا یقبل الجرح الا مفسراً (جرح قبول نہ کی جائیگی جب تک کہ اسباب جرح کی تشریح نہ کی گئی ہو) اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ قول ابن معین کا کہ فلاں ضعیف ہے اس وقت تک قبول نہ ہوگا جب تک کہ اس کے ضعیف ہونے کا سبب بیان نہ کیا جائے۔ اسی طرح اگر امام بخاریؒ نے کسی کی توثیق کردی ہے تو اس راوی کی حدیث قبول کرنے کے لیے ایک وجہ ترجیح پیدا ہو جائیگی، نہ یہ کہ اسکی حدیث قبول کر لینا لازم ہی ہو جائیگا۔ اس سلسلہ میں ماہرین فن اور ارباب استقراء کا یہ قول بھی پیش نظر رہے کہ ناقدین رجال میں سے نہ کبھی دو آدمیوں نے کسی ضعیف کی تعدیل پر اتفاق کیا نہ کسی ثقہ کی تضعیف پر" یعنی جس طرح دوسرے علوم میں ماہرین فن کے درمیان اختلاف ہوتا ہے اسی طرح جرح و تعدیل کے علم میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور جس طرح دوسرے علوم میں کسی ماہر کی رائے آنکھ بند کر کے قبول نہیں کی جاتی اسی طرح اس علم میں بھی نہیں کی جاسکتی۔

ناقدین کے ہر طبقہ میں کچھ لوگ متشدد ہیں، کچھ معتدل اور کچھ متساہل۔ مثلاً طبقہ اولیٰ میں شعبہ اور سفیان ثوری ہیں اور ان میں سے شعبہ زیادہ متشدد ہیں۔ طبقہ ثانیہ میں یحییٰ القطان اور ابن مہدی ہیں۔ یحییٰ القطان زیادہ متشدد ہیں۔ طبقہ ثالثہ میں ابن معین اور احمد ہیں۔ ابن معین متشدد ہیں۔ طبقہ رابعہ میں ابو حاتم اور بخاری ہیں۔ ابو حاتم متشدد ہیں۔ اسی طرح تساہل سے کام لینے والوں میں امام ترمذی و حاکم اور اعتدال پسندوں میں دار قطنی و ابن عدی وغیرہ شامل ہیں[1]۔ جو شخص رجال کو پرکھنا چاہتا ہو اسکے لیے لازم ہے کہ ان سب کی آراء کو سامنے رکھے اور پھر ان کے درمیان موازنہ کر کے رائے قائم کرے۔

راوی پر طعن کے اسباب کسی راوی کو ناقابل اعتبار ٹھیرانے کے لیے حسب ذیل دس وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ ہونی چاہیے:۔

(۱) ایک حدیث جو آنحضرت صلعم سے سرزد نہیں ہوئی اسکی روایت آپ سے عمداً بطور جھوٹ کرنا۔

---

[1] مقدمۂ فتح الملہم

(۲) عمداً جھوٹی حدیث جو قواعد معلومہ کے خلاف ہو روایت کرنا۔

(۳) راوی سے بکثرت غلطی کا صادر ہونا۔

(۴) راوی سے بکثرت غفلت ونسیان کا صادر ہونا۔

(۵) راوی میں علاوہ کذب کے قولاً یا فعلاً فسق کا خدشہ (جو موجب کفر نہ ہو) پایا جانا۔

(۶) راوی میں وہم کا پایا جانا،

(۷) راوی کا معتبر روایتوں کے خلاف روایت کرنا۔

(۸) راوی کا مجہول الحال ہونا (یعنی اس کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ کس حیثیت کا آدمی ہے)۔

(۹) راوی کا بدحافظہ ہونا۔

(۱۰) راوی میں بدعت کا پایا جانا۔

یہ آخری سبب کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔ بدعت کی دو قسمیں ہیں (۱) مستلزم کفر، (۲) مستلزم فسق۔ اول الذکر کی حدیث جمہور کے نزدیک نامقبول ہے۔ مگر بعض کا قول ہے کہ مطلقاً قبول نہ کی جائے اور بعض کی رائے ہے کہ اس شرط پر قبول کی جائے کہ وہ شخص عقیدۃً اپنے قول کی تائید میں دروغ گوئی کو حلال نہ سمجھتا ہو۔

اصل یہ ہے کہ ہر اس شخص کی خبر جس پر بدعت کی وجہ سے کفر کا فتویٰ دیا گیا ہو مردود نہیں ہو سکتی، اسلئے کہ ہر ایک فریق مخالف کو بدعتی سمجھتا ہے بلکہ کبھی مبالغہ کر کے اس پر کفر کا فتویٰ بھی عائد کر دیا کرتا ہے۔ پس اگر بدعت مستلزم کفر کی وجہ سے مطلقاً خبر مردود ہو جائے تو فرق اسلام میں سے کسی کی حدیث بھی مقبول نہ ہونی چاہیے۔ بنابریں قابل اعتماد یہی قول ہوگا کہ جو بدعتی حکم متواتر شرعی ضروری کا انکار کرتا ہو یا اسکا انکار کر کے خلاف جانب کا اعتقاد رکھتا ہو صرف اسی کی حدیث مردود سمجھی جائیگی۔ باقی جس بدعتی میں یہ امر نہ ہو اور ضبط اور تقویٰ بھی اس میں پایا جاتا ہو اسکی خبر قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

اور جس میں بدعت مستلزم فسق ہو اسکی حدیث میں اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ مطلقاً مردود

ہے - اسکی دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ اسکے قبول کرنے میں اسکی بدعت کی ترویج و اشاعت ہو گی - مگر یہ دلیل اگر تسلیم کر لی جائے تو پھر مبتدع کی وہ روایت بھی نامقبول ہونی چاہیے جس میں غیر مبتدع اسکا شریک ہو - کیونکہ اس سے بھی اسکی بدعت کی ترویج و اشاعت ہوتی ہے - بعض دوسرے لوگوں کا قول ہے کہ اگر وہ شخص دروغ گوئی کو حلال نہ سمجھتا ہو تو اسکی حدیث مطلقاً قبول کی جائیگی - اور بعض کا قول ہے کہ مبتدع اگر اپنی بدعت کی دعوت نہ دیتا ہو تو قبول کی جائے ورنہ نہیں، کیونکہ اس صورت میں بدعت کو خوشنما بنانے کی خواہش اس کو وضع اور تحریف پر آمادہ کر سکتی ہے - یہی قول اصح ہے - ابن حبان تو کہتے ہیں کہ جو مبتدع اپنی جماعت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اسکی حدیث مطلقاً قبول کرنے پر عموماً اتفاق ہے - لیکن اس میں مبالغہ ہے - البتہ اکثر کا قول یہ ہے کہ ایسے شخص کی حدیث قبول کی جائے بشرطیکہ وہ اسکی بدعت کی مؤید نہ ہو ورنہ بنا بر مذہب مختار مردود ہو گی - حافظ ابو اسحٰق ابراہیم بن یعقوب جوزجانی نے جو ابو داؤد و نسائی کے شیخ ہیں کتاب معرفۃ الرجال میں اسکی تصریح کی ہے - وہ لکھتے ہیں کہ "اگر راوی باوجود مخالف سنت ہونیکے صادق الکلام ہو تو جو حدیث اسکی منکر نہ ہو اسے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں بشرطیکہ اسکی بدعت کی مؤید نہ ہو"

تزکیہ و تعدیل
یعنی راوی کو معتبر قرار دینا

اکثر علماء فن کی رائے ہے کہ تزکیہ ایک شخص کا بھی معتبر ہے بشرطیکہ تزکیہ کرنے والا اسباب تزکیہ سے واقف ہو، ورنہ بلا غور و فکر سرسری نظر سے تزکیہ کر دینا کسی طرح معتبر نہیں ہو سکتا - ایک گروہ نے اس تزکیہ کو تزکیۂ شہادت پر قیاس کر کے کہا ہے کہ اس تزکیہ میں بھی تزکیۂ شہادت کی طرح دو شخص بقول اصح ہونے چاہئیں - مگر یہ قیاس مع الفارق ہے، اسلیے کہ یہ تزکیہ چونکہ بمنزلۂ حکم ہے اسلیے اس میں تعدد شرط نہیں - بخلاف تزکیۂ شہادت کے کہ وہ بمنزلۂ حکم نہیں بلکہ بمنزلۂ شہادت عند الحاکم ہے اس لیے اس میں تعدد ضروری ہے - پھر یہ اختلاف اُس تزکیہ میں نہیں جو بطور اجتہاد ہو بلکہ اس میں ہے جو بطور نقل ہو نقلی تزکیہ میں بھی تعدد شرط نہیں ہے کیونکہ نقل اصل کی فرع ہے - جب اصل میں تعدد شرط نہ ہوا تو فرع میں کیونکر شرط ہو گا؟

لہٰذا صحیح تر یہی ہے کہ جو شخص خود معتبر ہو اور اپنی ذمہ داری کو جانتا اور سمجھتا ہو تنہا اسکے بیان پر ایک راوی کو قابل اعتماد تسلیم کیا جاسکتا ہے، ابشرطیکہ راویوں کو معتبر قرار دینے میں اس کا تساہل معلوم و معروف نہ ہو۔

جرح مقدم ہے یا تعدیل؟ جرح و تعدیل میں تساہل و غفلت سے کام لینا علم حدیث میں سخت معیوب ٹھیرایا گیا ہے اسلیے کہ بلا حجت کسی راوی کی تعدیل کرنا گویا ایک غیر معتبر حدیث کو ثابت کرنا ہے، خوف ہے کہ ایسا شخص بمنزلہ اس شخص کے ہو جائے جو ایک حدیث کو کاذب گمان کرکے پھر اسکو روایت کرتا ہے۔ اور اگر بلا احتیاط جرح کی جائیگی تو ایک بے لوث مسلمان پر ایسا طعن عائد ہوگا جسکا داغ ہمیشہ اس کی پیشانی پر باقی رہیگا۔ جرح میں زیادتی کبھی خواہش نفسانی اور کبھی عداوت و حسد وغیرہ سے بھی ہوتی ہے۔ غالباً متقدمین کا کلام اس قسم کی زیادتی سے پاک ہے۔ اور کبھی اعتقادی مخالفت سے بھی ہوتی ہے۔ اس قسم کی زیادتی متقدمین و متاخرین میں بکثرت موجود ہے۔ اسی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص مجروح بھی ہو اور اس کی تعدیل بھی کی گئی ہو تو کس پہلو کو ترجیح دی جائیگی؟ بعض علماء نے عموماً جرح کو تعدیل پر مقدم سمجھا ہے۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی نسبت جرح و تعدیل دونوں کی گئی ہوں اور جرح کرنے والا اسباب جرح سے واقف ہو اور اس نے ان اسباب کو مفصل بیان کر دیا ہو تو اس صورت میں جرح تعدیل پر مقدم ہوگی۔ اور اگر جرح کرنے والا اسباب جرح سے ناواقف ہو یا واقف تو ہو مگر ان اسباب کو اس نے مفصل نہ بیان کیا ہو تو پھر تعدیل کو مقدم رکھا جائیگا۔

اگر کسی ایسے شخص پر جرح کی گئی ہو جسکی تعدیل کسی نے نہیں کی تو اس صورت میں بعض علماء کا میلان اس طرف ہے کہ اسباب جرح کی تفصیل ضروری نہیں۔ مجمل جرح قبول کرلی جائیگی، بشرطیکہ جارح اسباب جرح سے ناواقف نہ ہو۔ مگر ابن الصلاح کا میلان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو مجروح سمجھنے میں توقف کیا جائے[1] بہرحال جرح مجمل جمہور محدثین و فقہاء کے نزدیک مطلقاً مقبول نہیں ہے۔ اسلیے کہ بعض بڑے درجہ کے لوگوں نے بھی جرح میں زیادتی سے کام لیا ہے۔ مثلاً حافظ ابو محمد ابن حزم جو مشہور محدث و متکلم ہیں اپنے مسلک سے

[1] مقدمہ فتح الملہم۔

اختلاف رکھنے والوں پر اُن کا تشدد معلوم و معروف ہے۔ اس قسم کے متشدد حضرات اگر کسی شخص پر جرح کریں اور اسباب جرح کی تفصیل نہ دیں تو لازم نہیں ہے کہ انکی جرح قبول کر لی جائے۔ انکی جرح دراصل مجروح کے حق میں محض انکی رائے کی حیثیت رکھتی ہے، اور کچھ ضرور نہیں کہ انکی رائے کو دوسرے لوگ بھی تسلیم کریں۔ جرح و تعدیل اور قول العلماء بعضہم فی بعض پر علامہ ابن عبد البرؒ نہایت ہی منصفانہ اور محققانہ فیصلہ فرماتے ہیں جس کا خلاصہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں:-

"یہ مقام (جرح و تعدیل) ایسا مقام ہے جہاں بے شمار لوگوں سے لغزشیں ہوئی ہیں اور انکی وجہ سے ایک جماعت لاعلمی کی بدولت غلط فہمی میں پڑ گئی ہے۔ مامون طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کی عدالت مسلم اور اسکی امانت و جلالتِ علمی ناقابل انکار ہو، ثقاہت یقینی اور علمی شغف و سرگرمی میں کلام نہ ہو، اس کے بارے میں کسی شخص کی جرح قابلِ التفات اور درخورِ اعتنا نہ ہوگی، الا آنکہ جارح کوئی ایسا بین اور روشن ثبوت پیش کرے جس سے اسکی عدالت بطریق شہادت مجروح ہوتی ہو۔ رہا وہ شخص جسکی نہ امامت مسلم، نہ عدالت معلوم اور صحت روایت میں بھی اسکے ضعف حافظہ کی وجہ سے اشتباہ ہو سو اس کے بارے میں اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ اسے جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھ کر اسکی روایت پر قبول یا رد کا حکم لگایا جائے۔ اگر تم اسکی تحقیق کرنا چاہتے ہو کہ ایک مسلم امام کے متعلق کسی طعنہ زن کے کلام کا کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے تو سلف کے واقعات پر نگاہ ڈال کر دیکھو۔ ایک دوسرے کی شان میں ان کے بیشتر اقوال اور جرحیں موجود ہیں جن سے ان کی زبانیں بایں وجہ ملوث ہو گئیں کہ یا تو ان پر غضب و غصہ کی کیفیت طاری تھی، یا کوئی اور وقتی جذبہ غالب تھا، یا معاصرانہ چشمک تھی جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، مالک بن دینارؒ، اور ابو حازمؒ کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے۔ پس اگر علماء کے اقوال ایک دوسرے کے حق میں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی

جرحیں ایک دوسرے کے بارے میں تسلیم کرلی جائیں تو نئے نئے فتنوں کا دروازہ کھل جائے اور ضلالت وگمراہی کا بے پناہ طوفان برپا ہوجائے۔ غور کرو کہ حضرت سعید بن المسیبؒ کے متعلق حضرت عکرمہؓ کا قول کیسے معتبر ہوسکتا ہے؟ اور شعبی، نخعی، اہل حجاز، اہل مکہ، اہل کوفہ، اہل شام، اور امام مالکؒ و امام شافعیؒ وغیرہ وغیرہ کے متعلق اقوال اور جرحوں کا علم وبصیرت کی سرفرازی حاصل ہوتے ہوئے اور رشد وہدایت کی شاہراہ پر قائم رہ کر، اعتبار کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ اس لیے مناسب طریقہ وہی ہوگا جسے ہم اوپر بیان کرچکے ہیں، یعنی جس امام کی عدالت مسلم اور انہاک مشہور ومعروف ہو، ارتکاب کبائر سے محفوظ ہو اور تقویٰ وطہارت ناقابل انکار ہو اس کے بارے میں کسی شخص کی جرح جو دلیل وحجت سے عاری ہو معتبر ومقبول نہ ہوگی۔[1]

بعض اصطلاحات ائمہ جرح وتعدیل

جرح وتعدیل کے محض ضروری مباحث اوپر لکھے جاچکے ہیں۔ اب ائمہ فن کی مخصوص اصطلاحات کی طرف چند اشارات کیے جاتے ہیں جن سے واقف ہوئے بغیر کوئی شخص ان کے کلام کو نہیں سمجھ سکتا۔ امام مسلم نے اپنے معرکتہ الآرا مقدمہ میں اور امام ترمذی نے کتاب العلل میں صدہا نکات اور فنی معلومات کا دریا بہا دیا ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں۔ اسی طرح بعض اہم اصول اور اصطلاحات کتاب الام وغیرہ میں موجود ہیں۔ جو لوگ مطالعہ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں اگر وسعت ظرف نہیں تو کم از کم وسعت نظر ضرور پیدا کریں۔ ممکن ہے کہ اس طرح وسعت ظرف کی دولت وسعادت بھی ہاتھ آجائے، اور بجائے تنقید کے تحقیق کا مرتبہ حاصل ہوجائے۔

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ محدثین کرام جب حدثنی الثقۃ یا حدثنی العدل (مجھ سے ایک قابل اعتماد آدمی نے بیان کیا یا ایک عادل شخص نے) وغیرہ الفاظ بولا کرتے ہیں تو یہ تعدیل مبہم کہی جاتی ہے۔ اور جب لیس بثقۃ، لیس بشیء، ہو ضعیف، ذاھب الحدیث، مجروح، لیس بعدل، منکر،

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ جلد ثانی۔

متروک الحدیث، منکر الحدیث وغیرہ بولتے ہیں تو یہ جرح مبہم ہے۔ کشف اصول بزدوی میں ہے " ما الطعن من ائمۃ الحدیث فلا یقبل مجملا ای مبہما بان یقول ھذا الحدیث غیر ثابت او منکر او فلان متروک الحدیث او ذاھب الحدیث او مجروح او لیس بعدل من غیر ان یذکر سبب الطعن وھو مذھب عامۃ المحدثین والفقہاء "

یعنی " ائمہ حدیث جب مجمل طریقہ سے کسی پر جرح کریں مثلاً یوں کہیں کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے یا منکر ہے یا فلاں شخص متروک الحدیث ہے یا اس کی حدیث مقبول نہیں ہے یا وہ مجروح ہے یا وہ عادل نہیں ہے ۔ اور تفصیل نہ بیان کریں کہ یہ رائے انہوں نے کس بناپر قائم کی، تو عامۂ محدثین و فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ ایسی رائے قبول نہ کی جائیگی "۔

محدثین جرح مفسر کا لفظ بھی بولا کرتے ہیں جسکی دو صورتیں ہیں، (۱) یہ ہے کہ جارح نے سبب کذب، فسق وغیرہ کو مطلق چھوڑ دیا اور کوئی تعیین نہیں کی ۔ (۲) یہ ہے کہ جارح نے اس سبب کو بالتعیین ذکر کیا کہ یہ شخص فاسق ہے کیونکہ اس نے فلاں شخص کو فلاں دن فلاں مقام پر قتل کیا یا فلاں روز فلاں واقعہ میں جھوٹ بولا وغیرہ ۔ لیکن تعدیل مبہم یا جرح مجمل ہر حال میں ناقابل قبول نہیں ہے ۔ بعض ائمہ کی کچھ خاص اصطلاحیں ہیں جن سے واقف ہونے کے بعد ابہام دور ہو جاتا ہے ۔ مثلاً امام شافعی جب اخبرنی الثقۃ عن ابن ابی ذئب فرماتے ہیں تو اس سے انکی مراد ابن ابی فدیک ہوتے ہیں ۔ اور جب وہ اخبرنی الثقۃ عن الولید ابن کثیر کہتے ہیں تو ثقہ سے مراد ابو اسامہ ہوتے ہیں ۔ اور جب وہ اخبرنی الثقۃ عن اللیث بن سعد فرمائیں تو یحیٰی بن حسان مراد ہوتے ہیں ۔ اور جب اخبرنی الثقۃ عن ابن جریج کہتے ہیں تو وہ مسلم بن خالد الزنجی ہوتے ہیں ۔ اور جب اخبرنی الثقۃ عن صالح مولی التوامۃ فرمائیں تو ابراہیم بن ابی یحیٰی اور جب اخبرنی الثقۃ عن الاوزاعی فرماتے ہیں تو اس سے مراد عمرو بن ابی سلمہ ہوتے ہیں[۱] ۔ ابن معین کی بھی ایک اصطلاح " لیس بشئ " ہے ۔ موصوف جب اس لفظ کو بولتے ہیں تو اس سے انکی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس روای سے زیادہ احادیث مروی نہیں ہیں[۲] ۔ ابن معین کی اور بھی اصطلاحات ہیں ۔ مثلاً لیس بہ باس اور لا باس بہ کہ اس سے مراد

[۱] ارشاد الفحول، [۲] فتح المغیث

یہ ہے کہ یہ راوی قابل اعتماد ہے[1]

ابن قطان کی یہ عادت ہے کہ جس شیخ کے حق میں کسی نے ثقہ ہونیکی تصریح نہیں کی اس کے حق میں وہ لم یثبت عدالتہ (اس کی عدالت ثابت نہیں) لکھتے ہیں اور جس شیخ کی شان میں اسکے معاصر یا تلمیذ معاصر نے کلمات تعدیل نہیں کہے اس کے حق میں وہ لا یعرف لہ حال (اس کا حال معلوم نہیں) کہتے ہیں۔ امام دارقطنی بسا اوقات ایسے رواۃ کو مجہول کہدیتے ہیں جن کی توثیق دوسروں سنے کی ہے حالانکہ اُن کا یہ مسلمہ مذہب ہے کہ "جس شخص سے دو ثقہ آدمیوں نے روایت لی ہو وہ مجہول نہیں ہے اور اس کی عدالت ثابت ہے"[2] اسی طرح امام بخاریؒ کی بھی کچھ اصطلاحات ہیں۔ ان کی جرحیں ترکوہ، انکرہ الناس، المتروک، الساقط فیہ نظر، سکتوا عنہ، وغیرہ الفاظ کے ساتھ ہوا کرتی ہیں۔ وضاع، کذاب جیسے الفاظ سے جرح بہت کم آپ سے ثابت ہے[3]۔ بہت سخت جرح امام موصوف کی منکر الحدیث ہے۔ امام بخاری کی یہ اصطلاح ہے کہ جب وہ منکر الحدیث بولتے ہیں تو اس سے روایت جائز نہیں (قال ابن القطان قال البخاری کل من قلت فیہ منکر الحدیث لا یحل الروایۃ عنہ) اسی طرح علماء اہل حجاز کی ایک اصطلاح خاص ہے۔ وہ لفظ کذب کا استعمال خلاف واقعہ غلط اور خطا کے معنی میں کرتے ہیں۔ علامہ ابن حجر مقدمہ فتح الباری ترجمہ عکرمہ میں رقمطراز ہیں کہ "ابن حبان کی تصریح کے مطابق اہل حجاز خطا کے معنی میں کذب بولا کرتے ہیں"

مسئلہ تدلیس بسا اوقات راوی کا سقوط اس درجہ پوشیدہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اسانید وعلل سے خوب واقف ہیں وہی لوگ اس کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ جس خبر کی اسناد میں اس قسم کا پوشیدہ سقوط ہو اسے مدلّس کہا جاتا ہے۔ نور وظلمت کے اختلاط کو لغت میں دلس کہتے ہیں۔ خبر مدلّس کا راوی بھی چونکہ اس شخص کے نام کو چھوڑ کر جس نے اس سے حدیث بیان کی ہے، ایسے الفاظ بولتا ہے جن سے یہ وہم پیدا ہوجاتا ہے کہ

[1] فتح المغیث۔ [2] فتح المغیث وغیرہ۔ [3] مقدمہ فتح الباری۔

اس نے کسی ایسے شخص سے حدیث سنی ہے جس سے درحقیقت اس نے نہیں سنی، اس لیے اس کو مدلّس کہا جاتا ہے۔ مثلاً راوی نے امام حسن بصری سے حدیث نہیں سنی مگر قال الحسن یا عن الحسن کہتا ہے جس سے ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ اس نے بلا واسطہ امام حسن سے سنا ہے۔ یہ تدلیس ہے اور ایسے راوی کی روایت نامقبول ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر یہ راوی کہے کہ مجھ سے حسن نے بیان کیا یا میں نے سنا تو یہ تدلیس نہیں بلکہ سراسر کذب ہوگا۔

جس طرح خبر مدلّس قبول نہیں کی جاتی اسی طرح مرسل خفی بھی قبول نہیں کی جاتی۔ مدلّس اور مرسل خفی میں بہت باریک فرق ہے۔ تدلیس میں مدلس کی اپنے مروی عنہ سے ملاقات ہوتی ہے بخلاف مرسل خفی کے کہ صاحب ارسال گو اپنے مروی عنہ کا ہم عصر ہوتا ہے مگر اس سے اسکی ملاقات ثابت نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تدلیس میں بھی ملاقات شرط نہیں ہے صرف معاصرت کافی ہے۔ اس طرح تدلیس اور ارسال خفی دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں مغایرت ہے۔ اہل حدیث کا اتفاق ہے کہ تدلیس کے لیے صرف معاصرت کافی نہیں بلکہ ملاقات بھی شرط ہے۔ دیکھو ابو عثمان نہدی، قیس ابن ابی حازم وغیرہ مخضرمین آنحضرت صلعم سے جو روایت کرتے ہیں یہ تدلیس نہیں بلکہ ارسال خفی ہے۔ اگر تدلیس کا مدار صرف معاصرت پر ہوتا تو یہ لوگ مدلّس ثابت ہوتے، کیونکہ یہ آنحضرت صلعم کے معاصر تو تھے مگر ان کی آپ سے ملاقات ہوئی ہے یا نہیں، یہ غیر معلوم ہے۔ امام شافعی اور ابو بکر رازی کا مذہب ہے کہ تدلیس میں ملاقات شرط ہے، اور کفایہ میں خطیب کا کلام بھی اسی کا مقتضی ہے اور قابل اعتماد بھی یہی ہے۔

طبقات المدلسین محدثین کرام کی احتیاط اور غیر معمولی کد و کاوش صرف واضعین حدیث اور کمزور راویوں ہی کی جستجو تک محدود نہ رہی بلکہ جو لوگ مدلّس ہیں ان کا پردہ بھی انہوں نے چاک کیا اور ان پر مستقل کتابیں لکھیں۔ میرے پیش نظر کتاب طبقات المدلسین لابن حجر ہے۔ اسکے صفحہ ۲ و ۳ پر علامہ موصوف بیان فرماتے ہیں ؛

"قدماء میں سے جن لوگوں کی تصانیف میں مدلسین کا الگ تذکرہ کیا گیا ہے ان میں حسین بن علی الکرابیسی صاحب امام شافعی ہیں۔ پھر نسائی، پھر دارقطنی۔ پھر ہمارے استاذ الاساتذہ علامہ ذہبی نے کچھ اضافہ کیا ہے۔ پھر ان کے بعض تلامذہ نے اس باب میں ان کی پیروی کی جن میں سے ایک حافظ ابو محمد احمد بن ابراہیم مقدسی ہیں۔ علائی نے اپنی تصنیف میں وہ تمام چیزیں ایزاد کیں جو علامہ ذہبی سے رہ گئیں تھیں۔ پھر ہمارے استاد ابوالفضل بن حسین کا ذیل ہے۔

متأخرین میں جن لوگوں نے مدلسین کی تخریج کی ہے ان میں جلیل القدر محدث برہان الدین الحلبی ہیں جنھوں نے علائی کی پابندی نہیں کی۔ علائی کی کتاب میں کل اسماء جنکی تخریج ہوئی ہے ۶۸ ہیں۔ ابن عراقی نے اس پر ۱۳ ناموں کا اور اضافہ کیا ہے۔ حلبی نے ۲۲ نام اور زیادہ کئے ہیں، اور میں نے ان پر ۳۹ نام اور بڑھائے ہیں۔ پس میری کتاب میں کل ۱۵۲ نفوس کا تذکرہ ہے۔"

ان ۱۵۲ افراد و اشخاص کو پانچ طبقات پر تقسیم کیا گیا ہے۔ طبقہ اولی میں کل ۳۴ حضرات ہیں۔ طبقہ ثانیہ میں بھی ۳۳ ہیں۔ طبقہ ثالثہ میں پچاس ہیں۔ طبقہ رابعہ میں کل بارہ حضرات اور طبقہ خامسہ میں ۲۴ شامل ہیں۔

پس انصاف، تحقیق اور صحیح تنقید کا تقاضا ہے کہ جب آپ قدیم زمانہ کے محدثین کی تحقیق پر اعتماد کر کے واضعین حدیث اور ضعیف راویوں اور تدلیس کرنے والوں پر طعن کرتے ہیں اور ان کی روایتوں کو رد کر دیتے ہیں (درانحالیکہ خود آپ کے پاس ان کے حالات کی تحقیق کا براہ راست کوئی ذریعہ نہیں ہے) تو پھر انہی محققین کی تحقیق پر اعتماد کر کے ان لوگوں کو ثقہ اور قابل اعتماد بھی تسلیم کیجیے جن کو انھوں نے چھان بین کے بعد ثقہ قرار دیا ہے۔ ائمۂ حدیث کی صداقت اور حق پسندی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا

ہے کہ جو شخص جیسا اور جس حد تک ثقہ یا غیر ثقہ تھا اسکو انہوں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ویسا ہی بیان کر دیا۔ مگر اب جو حضرات تنقید حدیث کا دعویٰ لیکر اٹھتے ہیں ان کی دیانت کا حال یہ ہے کہ موضوع اور غیر معتبر احادیث اور جھوٹے اور کمزور راویوں کے متعلق جو معلومات پرانے زمانہ کے محققین نے فراہم کی ہیں ان کو تو یہ بڑی رنگ آمیزیوں کے ساتھ نقل کرتے ہیں، مگر صحیح اور مستند روایتوں اور ثقہ راویوں کے متعلق جو کچھ ان بزرگوں نے لکھا ہے اسے صاف چھپا جاتے ہیں۔ حدیث اور رجال کے سارے ذخیرہ میں ان کی یرقان زدہ آنکھیں صرف انہی چیزوں کو دیکھتی ہیں جو ان کے اپنے مطلب کی ہیں۔ یہ ہر طرف جھوٹ اور بے ایمانی ہی ڈھونڈتے ہیں اور ان کا جی یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی ساری تاریخ اور انکی مذہبی روایات کے سارے ذخیرہ میں جھوٹ اور جھوٹوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے، اس لیے جہاں سچائی اور سچے لوگوں کا ذکر آتا ہے، یہ بے چین ہو کر اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں تاکہ کوئی اسے نہ دیکھ سکے، اور جہاں جھوٹ اور جھوٹوں کا ذکر ہوتا ہے اسے لیکر یہ اس طرح اچھالتے ہیں کہ گویا تیرہ سو برس تک ان کے اسلاف اپنے نبی پر تہمتیں ہی تراشنے اور جھوٹی حدیثیں ہی گھڑنے میں لگے رہے ہیں اور ان میں کبھی کوئی سچا آدمی گذرا ہی نہیں ہے۔ کیسا پاکیزہ مقصد ہے جس کے پیچھے یہ ناقدین حدیث اپنا وقت اور اپنی محنتیں صرف کر رہے ہیں!

حقیقتِ نفاق

منافقین کی صفات اور ان کی اقسام

(از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی)

اسلام کے مقابلہ میں دو طاقتیں ہمیشہ سے نبرد آزما چلی آ رہی ہیں - ایک کفر، دوسری نفاق - تاریخ اسلامی کے ابتدائی صفحات ہمیں بتلاتے ہیں کہ اسلام کی راہ میں جتنی مشکلات کفار نے پیدا کیں وہ ان موانع کی بہ نسبت کہیں کم اور بے ضرر تھیں جو منافقین کی بدولت پیش آئے - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کفار کی بھی اکثر معاندانہ کارروائیاں انھیں منافقین کی خفیہ ریشہ دوانیوں کی رہینِ منت ہوا کرتی تھیں - بارہا انھوں نے مشرکین کو لڑائی پر ابھارا، غزوات میں مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں سے نقصان پہنچایا، رسول اللہ صلعم اور صحابہ کرام کی توہین و تذلیل کی، وطن اور حسب و نسب کے جھگڑے برپا کر کے مسلمانوں کی جمعیت پراگندہ کرنے کی کوششیں کیں، تقسیم غنائم کے موقع پر کمزور ایمان رکھنے والوں کو رسول اللہ سے بدظن کیا، اسلامی نظام کے تندرست پیکر میں طرح طرح کے وبائی جراثیم داخل کرنے کی سعی کی - غرض ضرر رسانی کے جتنے طریقے ممکن ہو سکتے تھے ان میں سے کسی کو بھی فتنہ و شیطنت کے ان علمبرداروں نے باقی نہ اٹھا رکھا - کفر تو اسلام کے مقابلہ میں بے نقاب آتا ہے - ڈنکے کی چوٹ، اپنی عداوت کا اعلان کر کے، کھلے میدان میں دعوت پیکار دیتا ہے - لیکن نفاق پیشانی پر مودّت و خلّت کا لیبل لگا کر اسلام کے گھر میں بیٹھ کر، صد ہا طریقوں سے اس کی بیخ کنی کرتا ہے، اور اس انداز میں کہ نگاہ ظاہر بیں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا - پھر غور فرمائیے کہ کفر کے مقابلہ میں نفاق کی خطرناکیاں کتنی زیادہ کتنی دینا؟

اور کیسی کارگر ہونگی - دن کی روشنی میں زمین پر پڑے ہوئے بڑے سے بڑے اژدھے کو مار ڈالنا کچھ مشکل نہیں، لیکن جو ناگن آستین میں چھپی بیٹھی ہو اس کے زہر سے بچنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔

خیر و شر کی کشمکش آج بھی اسی طرح جاری ہے جس طرح ابتدائے اسلام میں تھی اور آج بھی حق کے مقابلہ میں وہی دونوں طاقتیں مصروف جنگ ہیں جو بدر و احد کے میدانوں اور مدینہ کی گلیوں میں تھیں۔ وہی شرار بولہبی ہے اور وہی فتنہ عبداللّٰہی - اگر چالیس کروڑ مردم شماری کے مسلمانوں کے خلاف اقصائے عالم میں تقریباً پونے دو ارب "ابولہب" پھیلے ہوئے ہیں تو خود ان چالیس کروڑ کے اندر بھی بے شمار "عبداللہ ابن ابی" موجود ہیں، اور دونوں اپنے اپنے طور پر قرآن اور اسلام کی جڑ کھودنے میں منہمک ہیں۔ پس جس طرح اسلام کی مدافعت اور خدمت میں اس کے حقیقی پیروؤں کے لیے کفر کے اس شرار کو بجھانا ضروری ہے اسی طرح نفاق کے اس فتنہ کا سر کچلنا بھی ناگزیر ہے، بلکہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے یہ کار خدمت اولین توجہ کا مستحق ہے۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک زمانہ میں تو چند ہزار اسلامی سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی ننھی جماعت روم و ایران کی شوکتوں کو پاش پاش کرنے کے بعد بھی اپنے حوصلوں میں کوئی سستی اور اپنے جسموں میں کوئی تھکن نہ محسوس کرے، اور دوسرے زمانہ میں اسی اسلام کے نام لیوا اور اسی قرآن کے اتباع کا دعویٰ کرنے والے کروڑہا افراد اسلام کے کھلے باغیوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑے پڑے ہوں، اور اس دنیا کے بسنے والوں کے لیے اسلامی نظام جماعت وخلافت کا تصور تک عنقا ہو جائے اور خود مسلمانوں کو اس نظام کا نام لینے سے پہلے گھر کے دروازے بند کر لینے کی ضرورت محسوس ہونے لگے! آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا حق کی فطرت بدل گئی ہے؟ کیا خدا کا قانون الٹ گیا ہے؟ کیا اس انقلاب حال کی وجہ یہ ہے کہ فطرۃ اللہ پہلے اسلام کے غلبہ کی مقتضی تھی اور اب کفر کے غلبہ کی مقتضی ہو گئی ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یہ حقیقت مسلّم ہے کہ فطرۃ اللہ کبھی نہیں بدلتی تو ماننا پڑیگا کہ تغیر دراصل اسلام کی فطرت میں نہیں بلکہ خود مسلمانوں کے نفس میں ہوا ہے۔ چالیس کروڑ کے عظیم الشان عدد سے دھوکا نہ کھائیے۔ اس

تعداد میں حقیقی مسلمان کم اور منافق زیادہ ہیں، اور منافقین کی کثرت نے حقیقی مسلمانوں کی ایمانی طاقت کو بھی بے اثر بنا دیا ہے۔ اس قسم کی کثرت تعداد اسلام کے لیے وجہ مسرت نہیں باعثِ اذیت ہے۔ یہ دراصل آماس ہے جو اسلام کے جسم کو لاحق ہو گیا ہے اور اس کے اندر کی رہی سہی واقعی توانائی اور انرجی کو بھی بروئے کار نہیں آنے دیتا۔ جب وہ حرکت کرنا چاہتا ہے تو یہ آماس اس کا پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ پس آنکھیں چرانے کا وقت نہیں، مصلحت کوشی اور مداہنت پر ہزار بار لعنت ہو۔ کفر پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے خود اپنے جسم کے اس زہریلے آماس پر نشتر چلانے کی ضرورت ہے۔ پروا نہ کرنی چاہیے اگر اس عمل جراحی سے اس موٹے جسم کا کثیر مقدار میں خون نکل جائے۔ اگر ان چالیس کروڑ قطرہ ہائے خون میں سے تین سو تیرہ صالح قطرے بھی باقی بچ جائیں تو غم کیوں ہو؟ وہ تو اسلام کی عین صحت اور طاقت کا وقت ہوگا۔ لیکن اگر کوئی اس تجویز پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار نہیں تو پھر اسلام کی خدمت کے لیے جو راہ بھی چاہے اختیار کرے ناکامی اور محرومی کے ماسوا کچھ نہیں ہاتھ آنے کا۔ سورہ نساء کے مطالب پر غور کیجیے وہاں یہ حقیقت معلوم ہو گی کہ تمحیص مومنین کس طرح اسلامی تنظیم جماعت کا اصل الاصول ہے۔ اسے ترک کر کے اسلام کی بھلائی کا کوئی کام نہ اب تک ہو سکا ہے اور نہ اب ہو سکتا ہے۔

لیکن اسے مخالف اسلام طاقتوں کی خوش قسمتی کہیے یا اسلام کی بدقسمتی کہ اب حالات جس قدر ان کے حق میں سازگار ہیں پہلے نہ تھے۔ اور ساری باتوں کو تو چھوڑیے، سب سے بڑا سوال تو یہ ہے کہ ابولہب اور ابوجہل تو اپنا نام خود بتا دیتے ہیں اور ہم انہیں پہچان کر ان کے مکائد سے بآسانی بچ سکتے ہیں، مگر یہ عبداللہ بن ابی اور عبداللہ بن سبا جو ہماری جماعت میں ایک دو نہیں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، ان کا پتہ ہم کس طرح چلائیں؟ ان کے نام بھی مسلمانوں کے سے ہیں، ان کی زبانوں سے اسلامی مفاد کے نعرے اور اسلامی درد کے نالے بھی سننے میں آتے ہیں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات یہ ہاتھوں میں تسبیحیں اور بغل میں مصلے بھی لیے ہوتے ہیں۔ اب کہاں وہ نگہ نبوت کی معصوم بصیرت ہے جو ان مسلمانیت کا

سوانگ بھرنے والوں کی پس پردہ ذہنیتوں کو پڑھ کر ہمیں ان کے شر سے آگاہ کرے گی؟ اور کہاں وہ پیام رسانی روح امین ہے جو ہر موقع پر اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ کہہ کر ان بلند بانگ دعاوی فریب سے متنبہ کرے گی؟ بالخصوص جبکہ ہر شعبہ زندگی پر یہ لوگ "اکابر" اور "زعمائے ملت" بنکر چھائے ہوئے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان دشواریوں کے پیش نظر نظری حیثیت سے بھی مومن و منافق کی تمیز اور تحصیص بہت ہی مشکل اور دشوار طلب ہے مگر بحمد اللہ کہ ناممکن اور محال ہرگز نہیں ہے۔ قرآن حکیم اگر رب العالمین کا نازل کردہ ہے اور دنیا کی آخری زندگی تک کے لیے قول فیصل اور فرقان بن کر آیا ہے تو یقیناً اس کی قدر و حیثیت کا تقاضا ہے کہ اس حیرانی اور دشواری کے وقت بھی وہ ہماری رہبری کرے اور اس کی آیات ایک ایک منافق کی طرف انگلی اٹھا کر بتلا دیں کہ یہ آسمانی بادشاہت کا مفسد باغی جا رہا ہے اس کی فتنہ پردازیوں سے بچتے رہو۔ چنانچہ جب ہم اس غرض سے قرآن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معاً نفاق کی پوری اور بے آمیز تصویر وہ ہمارے سامنے کر دیتا ہے اور منافق کی شکل کو اس کے ایک ایک خط و خال کے ساتھ ہم اسی طرح دیکھ لیتے ہیں جس طرح دن کی روشنی میں سورج کو۔ لہٰذا مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام تصریحات کو مرتب کر دیا جائے جو قرآن نے وقتاً فوقتاً احوال و صفات منافقین کے متعلق ہمیں دی ہیں تاکہ ہر شخص کے ہاتھوں میں ایک مکمل اور شفاف آئینہ پہنچ جائے جس میں وہ منافقین امت کی حقیقی تصویر کا عکس دیکھ لے۔ پھر ہم منافقین کے بارے میں قرآن کا حکم بھی بیان کریں گے تاکہ ہر مسلمان خود فیصلہ کرے کہ ان لوگوں کے ساتھ اسے کونسا سلوک کرنا چاہیے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے ساتھ اس کے اخلاقی تمدنی، معاشرتی اور سیاسی تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔

ایک شبہ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ عہد نبوت کے بعد دنیا میں منافقین کا وجود نہیں رہا۔ اب یا تو کوئی شخص کافر ہو سکتا ہے یا مسلمان۔ کسی کے منافق ہونے کا نہ اب کوئی موقع ہے اور نہ ضرورت و علت کیونکہ منافق صرف اس وقت ہوا کرتے تھے جب اسلام دنیوی اسباب کے لحاظ سے ناتواں اور کمزور تھا اور اس کے مقابلہ میں کفر کی مادی ہیبت چہار دانگ عالم پر چھائی ہوئی تھی جو ہر لحظہ اسلام اور متبعین اسلام کو مصائب کے طوفان میں

جھونک دینے کی تیاریاں کیا کرتی تھی۔ اس وقت مسلمان ہونا گویا موت سے چشمک زنی کرنا اور دردناک تکلیفوں کو دعوت دینا تھا۔ اس لیے جو لوگ ان مصائب کو جھیلنے اور عیش دنیا کی قربانیاں سہنے کی اپنے اندر سکت نہ پاتے تھے وہ زبان سے آمنا و صدقنا کہا کرتے تھے اور ریخ کی صحبتوں میں اور خود اپنے دل کے اندر کفر کے حامی و پرستار تھے، تاکہ مسلمانوں کے خوف سے بھی مامون رہیں اور کفار کے خوف سے بھی۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْكُمْ وَیَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ۔ لیکن جب حالات منقلب ہو چکے، اسلام کی مغلوبیت اور کمزوری، طاقت و غلبہ سے بدل چکی، اور کفار کے ان خطرات کا اندیشہ نہ رہا جو اسلام کے دورِ مظلومیت میں تھا تو پھر کوئی منافقت اختیار کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کرنے لگا؟ اگر وہ قرآن کو حق تصور کرتا ہے تو کھلے بندوں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے گا اور اگر وہ اس پر ایمان نہیں رکھتا تو پھر زبان سے آمنا کہنے کی نہ کوئی مصلحت ہے نہ ضرورت۔

نفاق کی حقیقت یہ شبہ دراصل لفظ نفاق اور منافق کی حقیقت، اس کے محرکات، اس کے مصالح اور اس کے مظاہر پر پوری وسعت اور سنجیدگی سے غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر مذکورۂ بالا دلیل بغیر ردّ و قدح کے تسلیم بھی کر لی جائے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ منافق کی یہ خاص قسم اب نہیں پائی جا سکتی یعنی اس خاص مقصد اور مصلحت کی بنا پر اب کوئی شخص منافقت نہیں اختیار کر سکتا۔ اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اب نفاق کسی شکل میں موجود ہی نہیں رہا۔ منافق کی اگر ایک قسم اور منافقت کی اگر ایک علت نہیں رہی تو اس کے علاوہ متعدد اقسام اور علل اب بھی موجود ہیں اور ملت اسلام کی تباہی و بربادی کا کام نہایت ہوشیاری اور کامیابی سے سرانجام دے رہی ہیں۔ شیطان کے سیکڑوں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ اگر ٹوٹ جائے تو یہ کتنی بڑی نادانی اور بے بصری ہوگی کہ اسے ناکارہ اپاہج اور لولا سمجھ لیا جائے۔ نفاق کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ زبان سے خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت کا اقرار کیا جائے مگر دل میں خدا کے قانون اور رسول کی ہدایت سے کوئی لگاؤ نہ ہو، اور آئین قرآنی کے مقابلہ میں دنیوی مصالح، نفسانی رجحانات

اور جسمانی لذائذ زیادہ مرغوب ہوں بلکہ انھیں مصالح اور لذائذ کے حصول اور تحفظ کے لیے ایمان اور اسلام کو آڑ بنایا جائے۔ چنانچہ قرآن نے نفاق کی حقیقت کو خود ہی کئی جگہ کھول کھول کر بیان کیا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ
وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ
اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ
(بقرہ-۲)

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روز جزا پر ایمان لائے حالانکہ اندر سے وہ مومن نہیں وہ (بزعم خود) اللہ کو اور مسلمانوں کو فریب دینا چاہتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں وہ اپنے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے مگر انہیں اس حقیقت کا شعور نہیں۔

..... اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ
وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (مائدہ-۶)

جو اپنے منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے مگر ان کے دل میں ایمان کا شائبہ نہیں۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا
نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
لَكٰذِبُوْنَ (المنافقون-۱)

جب منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اس کے رسول ہو۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق (اپنے ادعائے ایمان میں) جھوٹے ہیں۔

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَ
مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ
(توبہ-۷)

اور یہ لوگ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں بلکہ وہ تو بالکل بزدل لوگ ہیں۔

اعراب کے دعوائے ایمان کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ
تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ

اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، ان سے کہدو کہ نہیں تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے

الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ۔ ہیں (یعنی بظاہر مسلمان ہیں) ورنہ ایمان کا تو ابھی تک تمہارے دلوں میں گذر تک نہیں ہوا ہے۔ (حجرات - ۲)

یعنی بظاہر اطاعت کر لینا ایمان کی دلیل اور سند نہیں ہے۔ ایسے "مسلمان" کو مومن ہونے کا نام تک نہیں لینا چاہیے۔ یہ وہ مسلمانیت ہے جس کی تہ میں خالص کفر کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے "مسلمان" اس اعلان و اقرار کے پہلے جس طرح کافر تھے، اللہ عالم الغیب کہتا ہے کہ ویسے ہی اس کے بعد بھی کافر ہے وَاِذَا جَآءُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَقَدۡ دَّخَلُوۡا بِالۡکُفۡرِ وَہُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِہٖ ؕ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡتُمُوۡنَ (مائدہ - ۹)

یہ ہے نفاق کی ماہیت جو ان آیات کے اندر جھلک رہی ہے۔ انھیں تصریحات کو سامنے رکھکر علمائے اصطلاحات شرعیہ نے نفاق کی تعریف اس طرح کی ہے:

ھُوَ الدُّخُولُ فِی الشَّرْعِ مِنْ بَابٍ وَالْخُرُوجُ عَنْهُ مِنْ بَابٍ۔[1]

پھر اس دخول و خروج کا محرک ہونا صرف ایک ہی شے تک تو محدود ہے نہیں۔ اس کے بیسیوں محرکات ہو سکتے ہیں۔ البتہ سب کی تہ میں حقیقت اور روح ایک ہی ہوگی اور ہو سکتی ہے یعنی قرآن پر عدم یقین اور دنیا پرستی۔ چنانچہ آگے کی تفصیلات میں آپ پائیں گے کہ تقریباً ہر گروہ منافق کے ادعائے ایمان پر عالم غیب انھیں جھوٹے، کذاب، منکر قرآن اور محارب اسلام کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔

منافقین کی اقسام اگرچہ نفاق کی اصل اور روح ہر جگہ ایک ہے لیکن اس کے مظاہر میں کافی تعدد پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہم کو دیکھنا چاہیے کہ قرآن کی رو سے منافقین کی کتنی اقسام ہیں اور ہر قسم کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔

بناوٹی مسلمان (۱) ایک قسم کے منافق وہ تھے جو اپنے قدیم مذہب پر سختی کے ساتھ جمے ہوئے تھے مگر بظاہر اسلام قبول کرنے کا اعلان محض اس لیے کرتے تھے کہ بعد میں مرتد ہو کر اسلام سے دنیا کو متنفر کریں اور لوگوں سے کہیں کہ اگر اسلام حق مذہب ہوتا ہم اسے قبول کر کے چھوڑ کیوں دیتے؟ قرآن اس گروہ کا ذکر بدیں الفاظ کرتا ہے۔

[1] ایک دروازہ سے حلقۂ اسلام میں داخل ہونے اور دوسرے سے نکل آنے کو نفاق کہتے ہیں۔ (مفردات امام راغب اصفہانی)

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (آل عمران-۸)

اہل کتاب میں سے ایک گروہ لوگوں کو سکھاتا ہے کہ مسلمانوں پر جو قرآن نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو انکار کردو تاکہ دوسرے بھی تمہیں دیکھ کر اس دین سے پھر جائیں۔

اسلام کی اجتماعی طاقت کو توڑنے اور اس کی ہوا اکھاڑنے کے لیے دشمنان الٰہی کا یہ کتنا موثر نفسیاتی حربہ تھا۔ آج یہ حربہ ایک دوسری طرح استعمال ہو رہا ہے۔ بعض پیدائشی اور خاندانی مسلمان اسلام کو اعتقاداً اور عملاً چھوڑ کر کسی دوسرے اجتماعی مسلک پر ایمان لے آتے ہیں اور پھر اس مسلک کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں جس سے لوگوں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر اسلام میں اجتماعی فلاح کی کوئی صورت ہوتی تو یہ مسلمان زادے کیوں فلاں "ازم" اور فلاں "ایت" کے پیچھے دوڑتے پھرتے۔ (حالانکہ یہ مسلمان زادے مسلمان تھے کب؟ یہ اسلام سے واقف کب ہوئے تھے کہ ان کے ترک اسلام سے یہ استدلال کیا جا سکے کہ انہوں نے اسلام اور کسی دوسرے "ازم" کا موازنہ کر کے موخر الذکر کو بہتر پایا؟) ہندوستانی مسلمانوں کو بڑے بڑے علمبرداران حریت مسلمان علمبرداران حریت — یہ سبق دیتے اور نہایت دلسوزی سے سمجھاتے ہیں کہ اس دور تجدید میں اس پرانے اسلام کو نہ لیے پھرو جو ایک خاص ماحول اور ایک خاص قوم کی اصلاح کے لیے تھا۔ دنیا ہزارہا منزلیں آگے نکل چکی ہے، اب وہ اصول کام نہیں دے سکتے۔ اب ایک نیا اسلام بناؤ — رضا شاہ اور اتاترک کو دیکھو آخر وہ بھی تو مسلمان ہیں بلکہ اسلام کی تلوار ہیں۔ اگر اسلام کے وہ قدیم اصول آج کام کے ہوتے تو یہ لوگ کیوں انھیں چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ اور فرانس کے قوانین اختیار کرتے؟ اس قسم کا وعظ "مسلمان" زعماء اور اہل قلم حضرات مسلمانوں کو برابر سنا رہے ہیں، لیکن چونکہ زمانہ ہے آزاد خیالی اور روشن خیالی کا اس لیے انھیں منافق نہیں کہا جاتا بلکہ یہ اسلام کے دوست، محافظ اور رہنما کہلاتے ہیں۔

دشمنان اسلام کے جاسوس (۲) اسلامی نظام کی تباہی کے لیے قرن اول کے منافقین کبھی ایک اور راستہ اختیار کرتے تھے۔ وہ اسلام کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کی جمعیت میں گھس جاتے تھے اور گھسے رہتے تھے تاکہ ان کے سیاسی عزائم و تدابیر کی ٹوہ لگاتے رہیں اور اپنی قوم کو یا دوسرے اعدائے اسلام کو ان سے باخبر کرتے رہیں۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس شر انگیز گروہ کے وسائس کو عریاں کیا گیا ہے:

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا

منہ سے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اطاعت گذار

مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ .... وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ (النساء - ١١)

ہیں مگر جب تمہارے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ تمہاری گفتگو اور تلقین کے برعکس دوسری ہی باتوں کا مشورہ کرتے ہیں...... اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آتی ہے تو اسے (اہل حل وعقد کے پاس صیغۂ راز میں رکھنے کے بجائے) مشہور کر دیتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ - (مائدہ - ۸)

تم دیکھو گے ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے، کہ وہ اہل کتاب میں بڑی دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر منافقین کی یہ صفت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَىٰ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَاجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ (مجادلہ - ۲)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا پھر وہ باز نہیں آئے اور برائی اور عدوان اور نافرمانی رسول کی باتیں کرتے رہتے ہیں

ان کے سینے ایک ایسے تنور کے مانند تھے جس میں اسلام کی نفرت اور عداوت کی آگ ہر دم جلتی رہتی تھی۔ وہ مسلمانوں کی برتری اور خوشحالی کو دیکھ کر غصہ سے پاگل ہو جاتے، اور انھیں مصائب و آلام میں گھرا دیکھ کر قلبی سکون و مسرت محسوس کرتے۔ قرآن نے ان کی اس کینہ جوئی کے مکروہ چہرہ سے یوں نقاب اٹھایا ہے:-

وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ .... إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ

جب یہ لوگ تم (مسلمانوں) سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں اور جب علٰحدہ ہوتے ہیں تو غصے کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں...... اور اگر تمہارا

سَیِّئَۃٌ یَّفْرَحُوْا بِھَا۔ (آل عمران ۱۲) کوئی بھلا ہوتا ہے تو ان کو رنج پہنچتا ہے اور اگر تمہیں کوئی گزند پہنچتا ہے تو بہت مگن ہوتے ہیں۔

جن لوگوں کو ترکی سلطنت کی پچھلی داستانیں معلوم ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح عثمانی خلافت کا قلب اس نوع کے منافقین اسلام کی سازشوں کا مرکز بن گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس اور انگلستان نے پیہم ہزیمتیں دیکر ترکوں کو بالکل نیم جان کر دیا اور پھر ان میں جان اس وقت آئی جب خلافت اسلامی نے پوری طرح دم توڑ لیا۔ ابھی یہ سلسلہ بند نہیں ہوا ہے اور نہ اس وقت تک بند ہو سکتا ہے جب تک اسلامی طاقت و حکومت کا کوئی دھندلا سا نشان بھی باقی ہے۔ کتنے ہی اہل فرنگ اب بھی اسی حربے سے کام لے رہے ہیں۔ مسلمان بن کر سلاطین عرب کے خاص مشیرانِ سلطنت میں شامل ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی زمام قابو میں رکھنے اور انھیں اپنا آلۂ کار بنانے کے لیے یہ نسخہ کتنا مجرب اور کامیاب ہے۔

مذہبی گروہ بندی کرنے والے لوگ (۳) منافقین کا ایک طبقہ وہ تھا جو مسلمانوں کی جماعت میں محض تفریق اور فتنہ و فساد برپا کرنے کی خاطر اسلام کا لیبل لگائے رہتا تھا۔ یوں تو جماعتی زندگی کے لیے تفرقہ عموماً مضرت رساں ہوتا ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ جو تفرقہ مذہب اور حق پرستی کی آڑ میں نمودار ہوتا ہے وہ ایسا زہر ہلاہل ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ منافقین نے اس نسخہ کو بھی پورے حزم و احتیاط کے ساتھ آزمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کفرزار مکہ سے مایوس ہو کر مدینہ کی طرف ہجرت فرما ہوئے تو ابتدا میں آپ نے شہر سے تین میل کے فاصلہ پر قبا نامی ایک مقام پر چند روز قیام فرمایا تھا (باختلاف مورخین چار دن یا چودہ دن وہاں قیام رہا)۔ اس اثنا میں باقاعدہ اور باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے آپ نے اپنے دست مبارک سے ایک مسجد کی بنا ڈالی جو مسجد قبا کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۹ھ میں ابو عامر راہب کے اشارے پر منافقین نے اس کے قریب ہی ایک اور مسجد بنائی اور مشہور کیا کہ کمزور اور مجبور لوگوں کیلیے، جو بارش یا رات کی تاریکی میں اُس مسجد تک نہیں جا سکتے، ہم نے یہ انتظام کیا ہے، اب وہ یہیں نماز پڑھیں گے۔ تعمیر ہو چکنے کے بعد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان منافقین نے استدعا کی کہ آپ بطور تبرک اس کا افتتاح فرمادیں، اس کے بعد ہم نماز پڑھیں گے۔ قبل اس کے کہ آپ ان کی خواہش کو عملاً شرف پذیرائی بخشتے، عالم الغیب نے ان بدطینت لوگوں کی مکروہ لیکن سخت خوفناک چالوں کا راز فاش کرتے ہوئے آگاہ کیا کہ :

"اور (ایک قسم کے منافقین وہ بھی ہیں) جنھوں نے اس غرض سے ایک مسجد تیار کی ہے کہ مسلمانوں میں تفریق پیدا کر کے انھیں نقصان پہنچائیں اور خدا کے ساتھ کفر کریں اور ان لوگوں کے لیے کمین گاہ بنائیں جو پہلے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کر چکے ہیں۔ (مسجد کی تعمیر تو اس فتنہ اور عداوت کی نیت سے عمل میں آئی ہے لیکن جب پوچھا جائیگا تو) قسمیں کھا کر کہیں گے کہ خیر اور نیکی کے سوا ہمارے ارادوں میں کوئی چیز نہیں۔ مگر خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ (پس اے پیغمبر) تم اس مسجد میں ہرگز نماز نہ پڑھنا .... (توبہ - ۱۳)

مسجد یعنی خدا پرستی اور امن و صداقت کے مرکز اور وحدت و اخوت کے سرچشمہ کو نفس پرستی اور تفرقہ انگیزی کا ذریعہ بنانا کچھ اُسی زمانہ کے منافقین کی خصوصیت نہیں تھی۔ کیا آپ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں کہ اس مرکز وحدت و جمعیت کو آج بھی اُسی طرح تفریق بین المومنین کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ مدینہ کے دشمنان حق نے تو ایک مسجد ضرار بنائی تھی لیکن یہاں علمبرداران حق نے مشرق سے مغرب تک ہزارہا ایسی مسجدیں بنا رکھی ہیں اور تبلیغ حق کے نام پر امت کو دعوت نزاع دے رہے ہیں۔ اسلام دشمنی کی یہ انتہائی خطرناک صورت تھی جسے منافقوں نے اختیار کیا تھا کہ فتنہ کو آشتی، شر کو خیر اور معصیت کو نیکی کے پردہ میں پیش کیا جائے یا بالفاظ دگر خیر و صلاح ہی سے شر و فساد کا کام لیا جائے۔ اُن منافقوں پر تو سو بار لعنت کی جاتی ہے جنھوں نے آغاز اسلام میں ایسی شر انگیز حرکت کی تھی، اس لیے کہ خدا نے صاف صاف ان پر نفاق کا الزام قائم کر دیا ہے۔ لیکن کیا تصور فرمائیں گے آپ دور حاضر کے ان پیشوایان دین کے متعلق جنھوں نے دین کو اپنی اہواء و آراء کی آماجگاہ بنا رکھا ہے؟ جو اسلام کے نام پر امت کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں جن کی مسجدوں کے دروازوں پر موٹے موٹے

حرفوں میں لکھا رہتا ہے کہ "اس مسجد میں کوئی وہابی نہ گھسے" "یہ مسجد اہل حدیث کی ہے، کوئی مقلد اس میں نماز نہیں پڑھ سکتا" "یہ مسجد فلاں فرقہ کی ہے دیگر فرقوں کو اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں"۔ اور ایسی ہی دوسری عبارتیں جنہیں پڑھ کر آنکھیں فرط حیرت سے اور دل شدت الم سے پھٹ جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گو اعمال اور نتائج ایک سے ہیں لیکن نیتوں میں فرق ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں جو مذہبی گروہ بندیاں ہیں ان کی تخلیق میں وہ غرض و غایت ہرگز نہیں جو اُن منافقین کے پیش نظر تھی۔ مگر اول تو ہمیں یہی نہیں معلوم کہ نیتیں متعین کس طرح کی جا سکتی ہیں؟ آخر مسجد ضرار کے بانیوں کی زبان سے بھی تو اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی کا ہی نعرۂ خلوص سنا گیا تھا۔ پھر اگر فرض کر لیا جائے کہ ان مدعیان اسلام کی نیتیں بالکل خالص اور بے لوث ہی ہیں تب بھی کیا سنکھیا کسی شخص کو موت کے حوالہ کرنے سے اس لیے باز رہ سکتی ہے کہ کھلانے والے نے اسے تریاق سمجھ کر کھلایا تھا؟ اگر یہ صحیح نہیں تو یہ کس طرح صحیح ہے کہ کعبہ سے کفر کی تبلیغ کرنا محض اس وجہ سے درگزر کے قابل ہے کہ تبلیغ کرنے والے کی نیت صاف ہے۔ افسوس ہے کہ یہ مصیبت جتنی ہی سخت اور ہولناک ہے اس سے اتنی ہی بے پروائی اور مداہنت برتی جا رہی ہے۔

نسلی اور وطنی افتراق پیدا کرنیوالے مفسد (۴) تفرقہ انگیزوں کا ایک دوسرا گروہ وہ تھا جو مہاجرین اور انصار میں نسلی، قومی اور وطنی عصبیتیں پیدا کرنے میں سرگرم رہتا تھا، اور مسلمانوں کی جماعت میں اس مقصد سے گھسا رہتا تھا کہ موقع پا کر نسلی اور وطنی حمیت جاہلیہ کو ابھار کر اس جماعت کی طاقت فنا کر دے۔ منافقوں نے یہ شرارت کئی بار کی غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر تو اسی شرارۂ قومیت نے سارے اسلامی خرمنِ اتحاد کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا اگر رسول اللہؐ کی مستحکم تربیت نے صحابہ کرام کو ان جہل پرستیوں سے بلند و بالا نہ کر دیا ہوتا۔ ایک انصاری اور ایک مہاجر میں معمولی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔ سید المنافقین عبداللہ ابن اُبَی نے موقعہ غنیمت جانا۔ انصار کو اپنے نسلی اور قومی مفاخر یاد دلائے اور کہا کہ یہ غیر ملکی اب تمہاری آستین کے سانپ بن گئے ہیں، کل تک تمہارے رحم و کرم پر جی رہے تھے، آج تمہارے منہ لگ رہے ہیں بلکہ ہمیں ___ خود ذلیل ہوتے ہوئے ___ ذلیل اور کمتر سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کے فتنہ سے لوگوں کو متنبہ کیا اور عزت و ذلت کے جاہلی تخیلات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ:

يَقُولُونَ لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ - (منافقون - ۲)

یہ منافق کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو عزت والا (اہل مدینہ) ذلیل لوگوں (آنحضرت اور مہاجرین) کو وہاں سے نکال باہر کرے گا - حالانکہ اصلی عزت تو اللہ ہی کیلیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے - لیکن یہ منافق جانتے نہیں -

اس قسم کے منافقوں کا تو آج عالم اسلامی میں جال بچھا ہوا ہے - اپنی جاہلی اغراض کی خاطر آئے دن نسلیت اور وطنیت کے سوالات اٹھا کر امت مسلمہ کے، جس کا کبھی ایک قبلہ اور ایک مرکز تھا، اب بے شمار قبلے اور مختلف مرکز بنائے جا چکے ہیں - فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ منافقین غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے اور آج کے دشمنان قرآن مسلمان گھروں میں پیدا ہوئے ہیں - لیکن جس طرح وہ پیشرو اپنی سفلی اغراض اور نفسانی رجحانات کی تکمیل کے لیے اسلامی نظام جماعت کو ڈھانا ضروری سمجھتے تھے اسی طرح ان کے مقلدین بھی اس نظام کو توڑنے ہی میں اپنے نفس کی فلاح سمجھتے ہیں - مگر جس طرح وہ اپنی تکمیل اغراض کے لیے اسلام کا نقاب اوڑھنا ضروری سمجھتے تھے اسی طرح یہ بھی مسلمانیت کا لبادہ اتار پھینکنا مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں - بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ وطنیت کی چھری سے اسلامی نظام جماعت کو ذبح کرتے وقت بھی زبان بسم اللہ اللہ اکبر کے ورد سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہ ہو -

مطلب پرست اور دورنگے لوگ (۵) منافقین کا ایک گروہ وہ ہوتا ہے جن کے سامنے اپنے ذاتی دنیوی فوائد ہوتے ہیں - یہ لوگ ہر اس راہ پر چلنے سے گریز کرتے ہیں جو ان کے لیے کوئی جانی یا مالی خطرہ پیدا کرنے والی ہو خواہ وہ حق کی راہ ہو یا باطل کی - یہ لوگ ابن الوقت اور موقع پرست ہوتے ہیں ان کو حق اور باطل کے جھگڑے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی - صرف اپنے شخصی مفاد سے دلچسپی ہوتی ہے جسکی خاطر وہ مسلمانوں سے بھی ملے رہنا چاہتے ہیں، اور کفار سے بھی تاکہ معرکۂ کفر و اسلام میں واقعات کا اونٹ جس کروٹ بیٹھے اسی

کروٹ پر یہ بھی بآسانی پلٹ جائیں۔ ابتدائے اسلام میں بھی ایسے منافقین کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ چنانچہ قرآن ان کی باطنی وظاہری خصوصیات کا تفصیلی خاکہ اس طرح کھینچتا ہے:

"اور بعض لوگ ایسے ہیں جو زبان سے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے حالانکہ وہ دل سے ایمان نہیں لائے ہیں (محض بربنائے مصلحت یہ کہکر) وہ خدا اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ وہ اس طرح خود اپنے ہی کو دھوکا دے رہے ہیں جبکہ وہ شعور اور ادراک نہیں رکھتے ...... اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (قانون اسلام کے مکمل تابع ہو جاؤ اور) زمین میں فساد نہ برپا کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو (کفار اور اہل اسلام کے باہمی جھگڑوں سے الگ رہ کر) صلح کل کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ یاد رکھو! یہی لوگ حقیقی مفسد ہیں (جو یک طرفہ صاف راہ نہیں اختیار کرتے) لیکن وہ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اس دورنگی کو چھوڑ کر) اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح کہ اور اہل اسلام ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی اُس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف غیر مآل اندیش اور نامصلحت شناس لوگ ایمان لائے ہیں؟ لیکن یاد رکھو! واقعی احمق اور ناانجام شناس یہی لوگ ہیں مگر وہ اس راز کو بوجھتے نہیں۔ اور جب مسلمانوں سے یہ لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ (مثلاً ہم بھی مومن ہیں) اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو یونہی مسلمانوں سے مذاق کرتے ہیں اور انھیں بیوقوف بناتے ہیں۔" (بقرہ - ۲)

خط کشیدہ فقروں پر غور کیجیے، یہ لوگ خدا کے قانون کی پیروی اور رسول کی کامل اطاعت کو فساد اور نقضِ امن کی بنا سمجھتے تھے۔ قرآنی اوامر و نواہی پر خلوص قلب کے ساتھ عمل کرنے کو "بے وقوفی" سے

تعبیر کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ کیسے احمق اور ناعاقبت اندیش لوگ ہیں جو کھلم کھلا قرآن کی حاکمیت تسلیم کر کے عرب و عجم کی دشمنی مول لیتے اور اپنے عیش و آرام کو برباد کرتے ہیں۔ مصلحت وقت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر فریق سے نباہتے چلو، ہر ایک سے اپنا مقصد حاصل کرو، اگر مسلمان شکست کھائیں تو کفار سے دوستی قائم رکھنے کا صلہ ملیگا گیہوں کے ساتھ گھن نہ پسے گا۔ اگر مسلمان فتح یاب ہوئے تو مسلمانوں میں شامل رہنے کا فائدہ حاصل ہوگا، جو دنیوی فوائد دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہونگے ان میں حصہ بٹانے کا موقع ملیگا۔ اور یہ دوہرا نفع اس طرح حاصل ہوگا کہ نہ اپنا ایک حبہ خرچ کرنا پڑے اور نہ اپنے پسینے کا ایک قطرہ بہانا پڑے۔ دیکھو ہمارا طریقہ کس قدر مصالحانہ اور امن آفریں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رسول کی کامل اطاعت کیوں ضروری ہو؟ ہر شریعت اپنی اپنی جگہ درست اور حق ہے، ایک کو دوسرے پر فضیلت کی کیا وجہ؟ امن اور صلاح کا راز اسی میں ہے کہ ہر ایک کو برحق قرار دو اور اس حق و باطل کے جھگڑے میں کسی کے ساتھ شریک نہ ہو۔

آگے چل کر اسی سلسلہ میں قرآن مجید ان لوگوں کی حالت کو ایک تمثیل کے پیرائے میں یوں بیان کرتا ہے:-

"یا ان منافقوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی بارش میں گھر گیا ہو جس میں کئی طرح کی تاریکیاں ہیں، کڑک ہے، بجلی ہے۔ کڑک ایسی سخت کہ جان کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دیے لیتے ہیں اور بجلی کا ایسا زور کہ آنکھیں اندھی ہوئی جا رہی ہیں۔ اور کافروں کو چاروں طرف سے خدائے قادر و توانا نے گھیر رکھا ہے۔ جب ان کے سامنے بجلی چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں دو قدم چل لیتے ہیں اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔" (البقرہ- ۲)

پچھلی تفصیل میں ان منافقین کی تصویر باطنی کے جو گوشے کسی قدر تاریکی میں رہ گئے تھے اس تشبیہ نے ان سب کو روشنی میں کر دیا ہے۔ یہاں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ وہ اپنی اس دورنگی کو نباہتے

کس طرح تھے اور "مسلمانیت" کے ظاہری دعوی کا حق کس حد تک ادا کرتے تھے۔ قرآن پر ان کا اعتقاد تو تھا ہی نہیں، محض اپنے دنیوی مفاد اور مقاصد کی خاطر زبان سے ایمان ایمان کا شور مچایا کرتے تھے اس لیے جب قرآن کے ہلکے اور بے ضرر احکام کا معاملہ ہوتا تو اس پر بڑی مستعدی اور تندہی سے عمل کرکے اپنی اسلامیت کا اظہار کرتے۔ لیکن جب سخت احکام کی باری آتی، جب عیش و آرام اور لذات دنیوی کی قربانی کا مطالبہ ہوتا تو یکایک سارا جوش ایمانی سرد ہو کر رہ جاتا۔ دہشت اور حیرانی کی تاریکیوں میں گھر جاتے اور موت کی سی غشی طاری ہونے لگتی۔ رب العالمین کے احکام جو دوسروں کے حق میں باران رحمت تھے وہ ان بدنصیبوں کے حق میں بجلی کے جان ستاں کڑکے بن گئے تھے کہ سنتے اور موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے۔

گویا ان منافقین کا مرکزی وصف یہ تھا کہ احکام الٰہی کی تعمیل ان پر سخت شاق گذرتی تھی۔ اور خدا کی شریعت ان کے لیے رحمت و نعمت ہونے کے بجائے الٹی مصیبت اور زحمت بن جاتی تھی۔
(باقی)

تنزیل و تاویل

امثال القرآن

(۵)

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

(۱۷) شرک کی نامعقولیت اور شرکا کی بیچارگی کی مثال۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (حج - ۱۰)

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو۔ اللہ کے ماسوا جن ہستیوں کو تم (بحیثیت معبود) پکارتے ہو، وہ (اس قدر عاجز و بیچارہ ہیں کہ) ایک مکھی تک نہیں پیدا کر سکتے خواہ سب کے سب مل کر ہی کیوں نہ پیدا کرنا چاہیں۔ اور اگر مکھی (جیسی ادنیٰ اور ہیچ مخلوق) ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس چیز کو واپس بھی نہیں لے سکتے طالب اور ان کے مطلوب دونوں ایک جیسے کمزور ہیں۔ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا نہیں جیسا کہ پہچاننے کا حق تھا۔ بیشک اللہ قوت اور غلبہ والا ہے (اس کے علاوہ ساری موجودات اس وصف سے بالکل محروم ہیں)۔

یہ مثال اس قابل ہے کہ ہر انسان اپنے قلب پر اس کو نقش کرلے اور اس کے معارف میں غرق ہو کر

فلسفۂ الوہیت پر غور و فکر کرے۔ اگر دل میں حق کی طلب ہوگی تو ناممکن ہے کہ وہ جمال وحدانیت سے مسحور ہوئے بغیر اس کی گہرائیوں سے واپس آئے۔ یہ تمثیل شرک کی جڑ بنیاد کھود کر رکھ دینے والی ہے۔ کیونکہ یہ ایک بدیہی اور مسلمہ حقیقت ہے کہ معبودیت کا کمتر سے کمتر درجہ یہ ہے کہ معبود اپنے بندوں کو نفع پہنچانے اور ان سے نقصان کو دفع کرنے پر قادر ہو۔ ورنہ اگر وہ اپنے اندر اتنی بھی سکت نہیں رکھتا تو اسے کیا حق ہے کہ اپنی پرستش کرائے اور لوگ اس کی پرستش کریں کیوں؟ لیکن مشرکین کے معبودوں کا کیا حال ہے؟ نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت رکھنا تو بڑی چیز ہے، وہ غریب اتنے بے بس، اتنے لاچار اور اتنے عاجز ہیں کہ سب مل کر بھی ایک مکھی تک نہیں پیدا کر سکتے، اور پیدا کرنا تو درکنار اگر مکھی جیسی کمزور مخلوق ان کے چڑھاوے میں سے کوئی چیز لے اڑے تو یہ کائنات کے "فرمانروا" اتنی بھی قوت نہیں رکھتے کہ اس سے اس چیز کو چھین کر واپس لے لیں اور اس سے اس گستاخی کا انتقام لیں۔ گویا ان سے بڑھکر ضعیف اور عاجز و ناتواں ہستی کوئی نہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی درست ہوش و حواس رکھنے والا انسان ایسی ہستیوں کے آگے سر جھکانے کو گوارا کس طرح کر سکتا ہے۔

یہ مثال شرک کی نامعقولیت اور مشرکین کی بے عقلی اور سفاہت پر ایک حجۃ بالغہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا طرز استدلال قرآن کے بلیغ ترین استدلالات میں سے ہے۔ اس کی روشنی میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیطان ان مشرکین کی عقلوں کو کس طرح الٹ دیتا اور کس حد تک ماؤف بنا دیتا ہے کہ وہ پتھر کی بے جان مورتیوں میں، جن کی طاقت اور قدرت کا یہ حال ہے کہ معمولی اور حقیر سے حقیر مخلوق کو بھی نہیں پیدا کر سکتیں، حتیٰ کہ اگر حقیر ترین مخلوق ان کی جناب میں گستاخی کر کے کوئی چیز سامنے سے اچک لے جائے تو سب کی سب مل کر بھی اسے چھڑا کر واپس نہیں لے سکتیں، ایسی بے جان اور بے حقیقت مورتیوں میں یہ عقل کے دشمن الوہیت جیسی چیز کا جلوہ دیکھتے ہیں اور انھیں معبود اور الٰہ سمجھ کر ان کے سامنے پیشانیاں ٹیکتے ہیں۔ حالانکہ معبود اور الٰہ کی معبودیت و الوہیت کا ابتدائی اور

بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس نے ساری مخلوقات کو پیدا کیا ہو، قادر مطلق ہو، ہمہ دان ہو، سب سے بے نیاز ہو، سب کا ملجا و مرجع ہو، فریاد رس اور معدلت گستر ہو۔

اس حقیقت کے اظہار کے بعد کہ الوہیت کے مقام اور اصنام کی حیثیت میں کتنا بعد المشرقین ہے، اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ "ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ" یعنی عابد و معبود دونوں یکساں ضعیف اور ناتواں ہیں۔ یہ تفسیر ان لوگوں کی ہے جن کا خیال ہے کہ یہاں طالب سے مراد عابد اور مطلوب سے مراد معبود ہے، یعنی ایک عاجز دوسرے عاجز سے چشم امید رکھتا ہے یا پیاسا پیاسے سے پانی مانگ رہا ہے اور یہ کتنی بڑی نادانی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں سالب اور مسلوب کی یکسانی دکھائی گئی ہے یعنی معبودانِ باطل اور مکھی دونوں ضعف و بیچارگی کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اس تاویل کی رو سے طالب وہ بت ٹھہرے اور مطلوب مکھی جو ان کا چڑھاوا لے اڑی ہو۔ ایک تیسری تاویل اور بھی ہے جو دوسری کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے نزدیک لفظ کی وسعت اور عمومیت ان سب تاویلات کو محیط ہے، اور ضعف کی نسبت عابد (بت پرست)، معبود (بت) اور سالب (مکھی) سب کی طرف ہے۔ پس ایسی ضعیف ہستی کو جو اپنی ہی طرح بے دست و پا ہو، اپنا مسجود اور اللہ قادر مطلق کا شریک قرار دینے والا دراصل الوہیت کے تصور سے عاجز ہے اور معبود کے علو و کمال کا دراصل کوئی احساس نہیں رکھتا ورنہ اس سے یہ ظلم عظیم ہرگز سرزد نہ ہوتا۔

(۱۸) کفار کے پتھر جیسے سخت دلوں سے حق کی آواز ٹکرا کر کس طرح ناکام واپس آتی ہے۔ اس کی مثال:

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ	کفار کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک ایسی چیز کو پکار رہا ہو جو پکارنے اور بلانے کی آواز کے سوا کچھ نہیں سنتی (یعنی پکارنے والے کا مطلب بالکل

لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (بقرہ - ۲۱) نہیں سمجھتی) یہ کافر لوگ نرے گونگے، بہرے اور اندھے ہیں جو کچھ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔

"نعیق" چرواہے کی اس آواز کو کہتے ہیں جسے وہ گلّے کو پکارنے اور بلانے کے وقت اپنے منہ سے نکالتا ہے۔ تجزیہ کرنے سے اس تشبیہ میں مشبہ بہ کے دو اجزاء اور افراد نکلتے ہیں۔ ایک ناعق یعنی چرواہا۔ دوسرا منعوق بہ یعنی گلہ۔ رہ گیا یہ امر کہ چرواہے اور گلے سے تشبیہ کس چیز کی دی گئی ہے سو اس بارے میں علمائے تفسیر کے چند مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق ناعق سے مراد بت پرست ہے جو اپنے بتوں کو بوقت احتیاج بلاتا ہے اور ان سے دعائیں مانگتا ہے۔ اور منعوق بہ سے مراد وہ بت ہیں جنھیں اس کے پجاری بلاتے ہیں۔ اس تاویل کے لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ بتوں کو بلاتے اور ان سے دعائیں اور منتیں مانگتے وقت کفار کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جو اپنے جانوروں کو چلا چلا کر بلاتا ہے اور وہ اس کی آواز کو سمجھتے تک نہیں۔ عبدالرحمن ابن زید وغیرہ کا یہی خیال ہے۔

علامہ زمخشری اور دوسرے بہت سے اہل تفسیر نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ "اِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً" کے الفاظ اس تاویل کا کسی طرح ساتھ نہیں دیتے، کیونکہ بت تو مطلقاً کسی آواز یا پکار کو سنتے ہی نہیں۔ اور آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اگرچہ منعوق بہ پکارنے والے کی بات کو سمجھتا تو نہیں مگر سنتا ضرور ہے۔ لہٰذا یہاں بتوں کو مشبہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اس اعتراض کے تین جواب دیے گئے ہیں۔

ایک یہ کہ اس جگہ لفظ (الا) زائد ہے۔ اور آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "کفار کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو بلا رہا ہو جو پکارنے اور چلانے کی آواز تک نہیں سنتی"۔ ظاہر ہے کہ یہ کس قدر پھسپھسا اور غلط جواب ہے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس انداز سے کی جائے کہ جس لفظ کو جہاں چاہا زائد کہہ دیا اور جس کو جہاں ضرورت سمجھی محذوف قرار دیدیا تو قرآن بازیچۂ اطفال بن جائیگا۔ اور تحریف معنوی کا دروازہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا

جائے گا۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں تشبیہ میں پیش نظر محض دعاء (بلانا اور آواز دینا) ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ بلانے کا انجام دونوں جگہ یکساں ہے۔ اس جگہ مدعو کی (یعنی جس کو بلایا گیا ہو، اس کی) خصوصیات سے بحث نہیں ہے۔ اس لیے اگر مشبہ بہ میں ایک ایسی زائد صفت اور خصوصیت پائی جائے جو مشبہ میں موجود نہیں تو اس سے نفس تشبیہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تیسرے جواب کی رو سے آیت کی توضیح اس طرح ہوگی کہ "ایسے خود ساختہ معبودوں سے، جن کو احساس تک نہیں ہوتا کہ انھیں مخاطب کرکے کوئی کیا کہہ رہا ہے، دعائیں مانگنے والوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے ریوڑ کو بلا اور پکار رہا ہو اور اس پر اس کے بلانے اور چلّانے کا کوئی اثر نہ ہو رہا ہو اور اس کی ساری چیخ پکار کا حاصل صرف یہی ہوتا ہو کہ بس وہ بلائے جا رہا ہے۔ یہی مشرک کا حال ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے گونگے بہرے خداؤں کو گڑگڑا گڑگڑا کر بلاتا ہے اور گڑگڑانے اور دعائیں مانگنے کی محنت مشقت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

دوسری تاویل یہ کی گئی ہے کہ کفار کی مثال ان بہائم کی سی ہے جو چرواہے کی پکار کا مطلب بالکل نہیں سمجھتے۔ صرف اتنا محسوس کرتے ہیں کہ اس کے حلق سے آواز نکل رہی ہے۔ یعنی اس تاویل کے قائلین کے نزدیک راعی سے مراد پیغمبر ہے جو کفار کو حق کی طرف بلا رہا ہے اور بہائم سے مراد اہل کفر و شرک ہیں جنھیں داعی حق بلا رہا ہے مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سیبویہ نے آیت کی تشریح اسی طرح کی ہے۔

اس تمثیل کو تشبیہ مرکب بھی مانا جا سکتا ہے اور تشبیہ مفرق بھی۔ پہلی صورت میں صدائے حق کو نہ سمجھنے اور اس سے فائدہ نہ اٹھانے والے کفار کی تشبیہ دینی مقصود ہوگی اُس گلہ سے جو چرواہے کی پکار کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتا کہ وہ کچھ بول رہا ہے۔ اور اگر اسے تشبیہ مفرق مانا جائے یعنی وہ تشبیہ جس میں مشبہ اور مشبہ بہ کے تمام متقابل اجزاء میں مماثلت اور مشابہت ضروری ہوتی ہے تو اس صورت میں کفار بمنزلۂ بہائم کے ہوں گے، اور دعوتِ حق و ہدایت بمنزلۂ نعیق (جانوروں کو بلانے کی آواز) کے ہوگی اور ان کفار کا اس دعوتِ حق کو صدائے محض سمجھنا

بمنزلہ ادراک بہائم کے ہوگا جو چرواہے کے بلانے اور پکارنے کی آواز کو ایک بے معنی آواز سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

(۱۹) انفاق فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل الطاغوت کی مثال :

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ...... يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ

جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان کی (خیرات کی) مثال اس دانے کی سی ہے جس میں سات خوشے اور ہر خوشہ میں سو دانے پیدا ہوں اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے برکت عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت اور قدرت رکھنے والا نیز ہر شے سے باخبر ہے...... اے ایمان والو اپنے صدقات کو احسان جتاکر اور (سائل کو) ایذا دیکر اکارت نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ جو شخص اس طرح کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر (تھوڑی سی) مٹی پڑی ہو، پھر اس پر تیز بارش ہو اور (مٹی کی اس پتلی سی تہ کو بہا کر چٹان کو چکنی اور سپاٹ کرکے چھوڑ دے (یہی انجام ہے ریاکار صدقہ دہندگان کا قیامت میں)۔ یہ لوگ اپنے دیے ہوئے صدقات میں سے کچھ نہ حاصل کرسکیں گے اور اللہ ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال خرچ

أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّأَعْنَابٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ
الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ
ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ
كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝

(بقرہ - ۲۶۶)

کرتے ہیں محض خدا کی رضا جوئی کے لیے نیز خلوص اور ثبات قلبی کے ساتھ، ان کی خیرات کی مثال ایک باغ کی سی ہے جو ٹیلے پر واقع ہے، پھر اس پر زور کا مینہ برسا اور (عام انداز سے) دوگنا پھل لایا اور اگر اس پر زور کی بارش نہ بھی ہوئی تو اسے ہلکی پھوار (بھی بس کرتی ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کریگا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اس کے نیچے نہریں بڑی بہ رہی ہوں، اس میں ہر قسم کے میوے ہوں اور بڑھاپا اُسے آئے اور اس کے چھوٹے چھوٹے ناتواں بچے ہوں۔ (ایسی حالت میں) باغ پر آتش بگولا چلے اور وہ جل بھن کر رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لیے یونہی کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔

یہ ایک مفصل تمثیل ہے جس میں انفاق لوجہ اللہ اور انفاق ریائی دونوں کی حقیقت اور دونوں کے انجام اور ثمرات کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ پہلے انفاق فی سبیل اللہ کے انجام کی مثال دی گئی ہے کہ خدا کی راہ میں — خواہ جہاد میں یا کسی نیک کام میں — خرچ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو زمین میں بیج ڈالتا ہے اور ہر بیج سے سات خوشے پیدا ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے اندر سو سو دانے ہوتے ہیں گویا ایک دانہ بو کر سات سو حاصل کرتا ہے۔ اللہ کے لیے مال قربان کرنے والا یونہی اپنا مال ضائع نہیں کرتا بلکہ درحقیقت کئی گنا اسے بڑھاتا ہے۔ اس بڑھوتری کا انحصار خرچ کرنے والے کے خلوص اور ایمان پر نیز مال کی نافعیت اور حقدار کی حیثیت پر ہے۔ کیونکہ صدقہ کا ثواب صدقہ دینے والے کی قلبی کیفیت کے لحاظ سے متفاوت

ہوا کرتا ہے۔ نیت ایک میزان ہے جس پر ہر عمل کا وزن کر کے اس کا بدلہ متعین کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آگے چل کر اس انفاق کی، جس کا ثواب حد مذکورہ تک پہنچنے والا ہے، یعنی کمال انفاق کی دو صفتیں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ محض اللہ کے لیے ہو شہرت پسندی اور ریاکاری کا اس میں شائبہ تک نہ ہو۔ دوسری صفت تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ کی ہے۔ تثبیت کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ خیرات دینے والا صدقہ نکالتے وقت دل میں کسی قسم کی تنگی نہ محسوس کرے بلکہ کھلے دل سے اور ثبات قلب کے ساتھ دے اور مال کو اپنے ہاتھ سے نکالنے سے پہلے اپنے دل سے نکال دے۔ یہی تثبیتِ نفس ہے جو اموال خیرات کی مقدار اور نوعیت کے ساتھ مل کر خیرات و صدقات کی قدریں مقرر کرتا ہے یہاں تک کہ وہ سیکڑوں گنا زیادہ معاوضہ تک پہنچ جاتی ہیں۔

اس کے بعد یہ دیکھو کہ اس صدقہ کی حقیقت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی معنویت کو کس طرح مشہود کرایا ہے۔ سو پہلے تو اللہ تعالیٰ نے صدقہ کو بیج سے تشبیہ دی ہے، گویا اپنے پاک مال کو بغیر کسی دوسرے جذبہ کے خلوص دل سے خدا کی راہ میں خیرات کرنے والا ایک کسان ہے جو اپنے مال کو عمدہ اور ستھری زمین میں بوتا ہے۔ اب پیداوار کا کم و بیش ہونا بیج کی عمدگی، زمین کی زرخیزی، پودوں کی آبپاشی اور خود رو گھاس پات سے ان کی حفاظت پر منحصر ہے۔ اگر یہ تمام لوازم بدرجہ کمال موجود ہو جائیں اور کھیتی پر کسی قسم کی ارضی یا سماوی آفت نہ آئے تو وہ نہایت شاداب اور زوردار ہوگی اور اس کی مثال اس باغ کی سی ہوگی جو اونچی زمین پر واقع ہے، جہاں اسے ہر وقت کھلی ہوا، دھوپ اور روشنی مل رہی ہے اور اس کے درخت پوری آزادی کے ساتھ نشو و نما حاصل کر رہے ہیں۔ پھر ابر بہار آتا ہے اور جی کھول کر اسے سیراب کرتا ہے۔ انجام کار اس کے درخت دوسرے درختوں کی بہ نسبت دو چند پھل لاتے ہیں اور اگر موسلا دھار بارش نہیں بھی ہوتی تو ہلکی سی بارش بھی اس کے لیے کافی ہوتی ہے، کیونکہ اس کی زمین اپنے اندر روئیدگی کی کامل استعداد رکھتی ہے۔

یہی حال ہے اس صدقہ کے نشو و نما اور اس کی برومندی کا جو خلوص اور للّٰہیت کی مقدس زمین میں بویا

جاتا ہے۔ اسبابِ نمو کے تفاوت کے لحاظ سے اس کے حاصل میں بھی تفاوت ہوتا ہے۔ وابل (زور کا مینہ) اور طل (ہلکا مینہ) کے الفاظ اسی تفاوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض صدقے وابل کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض طل کی۔ جو جیسا راہِ خدا میں دے گا ویسا ہی وہاں سے اجر بھی پائیگا۔

اس کے برعکس معاملہ ہے اس شخص کے انفاق کا جو خرچ تو کرتا ہے لیکن بے فائدہ جس کا کوئی حاصل نہیں۔ یعنی خدا کے لیے اور تثبیت نفس کے ساتھ نہیں دیتا بلکہ شہرت طلبی اور ریاکاری کے جذبہ کے ماتحت دیتا ہے۔ انجام کار اس کا سارا دیا دلایا اکارت جاتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال اللہ تعالیٰ نے اس بدبخت اور حسرت نصیب انسان سے دی ہے جس کے پاس کھجور اور انگور کے بیش قیمت باغات ہوں، جس کے نیچے نہریں پڑی بہ رہی ہوں اور اسے برابر سیراب و شاداب رکھتی ہوں ہر قسم کے پھل لگے ہوئے ہوں۔ اور وہ خود کہن سالی کی عمر کو پہنچ چکا ہو، اسکی اولاد خردسال اور ناتواں ہو، یعنی نہ خود کمانے کی سکت رکھتا ہو اور نہ بچے اس قابل ہوں۔ ایسی حالت میں جبکہ وہ باغ کی برومندی کا سخت حاجتمند ہے۔۔۔ لوؤں کی لپٹ آئے اور سارے باغ کو جھلس کر خشک کر دے بالکل یہی حال ہے۔ اس شخص کا جو دکھانے کے لیے اپنا مال خیرات کیا کرتا ہے۔ ابھی تو اپنی فیاضی کے غرور میں سرمست ہے۔ لیکن جب اس فیاضی کی قیمت معلوم ہونے کا وقت آئیگا اور داورِ محشر کے سامنے اس کا اعمالنامہ کھولا جائیگا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ ہوگی کہ جس کشتِ عمل کی شادابی اور ثمروری پر وہ اس قدر نازاں تھا اور اس پر اعتماد کیے بیٹھا تھا، عین اس وقت جبکہ وہ اس کے ثمرات کا سخت حاجتمند ہے، ساری کھیتی جل کر خشک ہو چکی ہے، اور مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ اب دوبارہ جوتنے بونے کا موقع بھی نہیں۔ وجہ مشابہت دونوں کے انجام میں صاف ہے، یعنی شدید احتیاج کے وقت نعمت کا چھن جانا، آرزوؤں کا تاراج ہو جانا اور ہیبت ناک حسرتوں سے دوچار ہونا۔

اس امر میں کہ یہ مثال کس شخص کی دی گئی ہے، بعض دوسرے اقوال بھی مذکور ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ اس شخص کی مثال ہے جس کا خاتمہ فساد انگیزی اور فتنہ پروری پر ہوا ہو۔ امام مجاہد کا قول ہے کہ یہ

اس شخص کے حالات کی تمثیل ہے جو زندگی بھر طاعت الٰہی میں کوتاہیاں کرتا رہا ہو۔ سُدّی کے نزدیک یہ اس ریاکار کی تشبیہ ہے جس نے خدا کی رضاجوئی کو نظرانداز کرکے داد و دہش کی ہو۔ یوں تو آیت کے عموم میں ہر قول کی سمائی ہے، لیکن سیاق و سباق آخری قول کی ہی تائید کرتا ہے۔

اس تمثیل کا ایک حصہ اب اور باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی صدقات باطلہ کی مثال۔ صدقات کو باطل کرنیوالے امور دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو صدقات کو ذریعۂ ثواب اور علت ثواب بننے ہی سے روک دیتے ہیں، مثلاً ریا اور نام و نمود کی خواہش۔ دوسرے وہ امور جو صدقات کو ذریعۂ ثواب بننے سے تو نہیں روکتے لیکن اس ثواب کو باطل اور معدوم کر دیتے ہیں جو ان صدقات کے عوض ملنا چاہیے تھا مثلاً احسان جتانا، یا سائل کو ایذا دینا۔ ایسے صدقات کی مثال اللہ تعالیٰ نے اس سخت اور سپاٹ چٹان سے دی ہے جس پر مٹی کی ایک ہلکی سی تہ آکر جم گئی ہو، پھر تیز بارش آئے اور مٹی کی اس تہ کو بہا کر چٹان کو کھلی ہوئی سپاٹ حالت میں چھوڑ دے۔ اس تمثیل کے اجزاء اور مشبہ کے اجزاء کے ساتھ انکے تطابق کو دیکھو، قرآن کی شان عظمت اور اس کے اعجاز بیان کا کیسا روشن آئینہ ہے۔ اللہ کی خوشنودی کو چھوڑ کر دنیوی جاہ و نمود پر اپنا مال قربان کرنیوالے یا خیرات کرکے احسان جتانے اور سائل کو تکلیف دینے والے آدمی کے قلب نا آشنائے اخلاص کو پتھر سے اور اسکے عمل کو چٹان پر جمی ہوئی مٹی سے تشبیہ دینے میں کتنے لطیف نکات پنہاں ہیں پتھر کی سختی مٹی کو اپنے اندر بارانی جذب نہیں کرنے دیتی اور نہ اسے روئیدگی کی اجازت دیتی ہے کیونکہ اس کی فطرت میں یہ مادہ ہے ہی نہیں کہ بارش ہونے کے بعد مٹی کے ذرات کو اپنے سے ملائے رکھ سکے اور انہیں پانی اور روئیدگی قبول کرنیکا موقع دے سکے۔ معمولی زمین کے لیے تو بارش سبب روئیدگی ہے۔ مگر چٹان پر جمی ہوئی مٹی کے لیے بارش ہونے کے معنی رہی سہی روئیدگی بھی ضائع ہو جانے کے ہیں۔ اسی طرح جو قلب خلوص، للّٰہیت اور ایمان و اخلاص سے عاری ہوتا ہے اور محض نمائش کے لیے فیاض بنا رہتا ہے جب اس پر آسمان شریعت سے اوامر و نواہی کی بارش ہوتی ہے تو وہ اسے قبول نہیں کر سکتا اور انجام کار غبار کی ہلکی سی وہ تہ بھی، جو اس پتھر یلے قلب پر نقاب بنکر پڑی ہوئی تھی، اس بارش کے ریلے میں بہ جاتی ہے اور اس کا دل اپنی اصلی ہیئت میں ایک سپاٹ پتھر کی طرح ننگا ہو کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں نشو و نما کی کوئی استعداد ہی نہیں ہوتی۔

(باقی)

رسائل و مسائل

بے اصل فتنے

کلکتہ سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

"چند امور متعلقہ تفسیر قرآن نے بکثرت لوگوں کو خلفشار میں ڈال رکھا ہے۔ ایک تفسیر لکھی گئی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جا رہا ہے کہ وہ اسلام کے عقائد کے خلاف ہے اور الحاد و دھریت کی موجب ہے۔ چند آیات کی تفسیر بطور نمونہ اس کتاب سے نقل کرتا ہوں اور اس پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ بھی مختصراً بیان کیے دیتا ہوں۔ معترضین اس کتاب کے مصنف کی تکفیر کرتے ہیں۔ مہربانی فرما کر آپ ایک فیصلہ کن بحث کر کے بتائیں کہ آیا ان میں کوئی چیز موجب کفر ہے یا الحاد و دھریت ہے ؟

(۱) - وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ۭ قَالَ فَخُــذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا (البقرہ - ۳۵)

تفسیر - خط کشیدہ فقرے کا مطلب یہ ہے کہ چار پرندے لو اور انکو اپنی طرف مائل کرو یعنی اپنے سے اس طرح مانوس کر لو کہ جب تم انہیں چھوڑ دو تو وہ تمہاری طرف پلٹ کر آئیں - پھر ان کا ایک ایک جزو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو -

اعتراض - مفسر نے مندرجۂ بالا الفاظ میں معجزۂ ابراہیمی کا انکار کیا ہے -

(۲) - اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ (ص - ۲)

تفسیر۔ حضرت داؤد جب پہاڑوں اور پرندوں کو دیکھتے تو ان کو خدا یاد آتا۔

اعتراض۔ اس تفسیر میں نیچریت کا رنگ غالب ہے۔ متعدد آیات قرآنی کا مندرجہ بالا معانی سے انکار لازم آتا ہے۔ قرآن کا سیاق و سباق بتلاتا ہے کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤد کے ساتھ مشغول تسبیح ہوا کرتے تھے

(۳) وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ (سبا - ۲)

تفسیر۔ الناله الحدید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو لوہا نرم کرنیکا طریقہ سکھا دیا تھا۔

اعتراض۔ سلف کی تفسیر کے خلاف ہے۔ سلف کا قول یہ ہے کہ لوہا حضرت داؤد کے ہاتھ میں آٹے کی طرح نرم ہو جاتا تھا۔

(۴)۔ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (آل عمران ۴)

تفسیر۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت مریم اس رزق کو اللہ کی بخشش کی طرف منسوب کرتی تھیں۔ اس آیت میں کوئی دلیل اس پر نہیں ہے کہ حضرت مریم کو گرمی کا میوہ جاڑے میں اور جاڑے کا گرمی میں ملتا تھا۔

اعتراض۔ یہ سلف کی تفسیر کے خلاف ہے۔

(۵)۔ وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ (اعراف - ۱۷)

تفسیر۔ مطلب یہ ہے کہ "ہم نے ان احکام کو الواح میں لکھنے کا حکم دیا"

اعتراض۔ بخاری کی روایت وخط لك التوراة بیده کی تکذیب ہوتی ہے۔

(۶)۔ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا (یوسف - ۳)

تفسیر۔ یعنی اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

اعتراض۔ حضرت ابن عباس کی تفسیر کہ وہ شاہد بچہ تھا کی تکذیب ہے۔

(۷)۔ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ (انعام - ۲۰)

تفسیر۔ یعنی جب موت کا دن آئیگا۔

اعتراض - امام احمدؒ بخاری اور مسلم کی روایات سے ثابت ہے کہ اس سے وہ دن مراد ہے جب سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا - یہ تفسیر اس روایت کے خلاف ہے -

(۸) یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (ابراہیم - ۴)

تفسیر - اللہ توحید کی برکت سے دنیا اور آخرت کی زندگی میں مومنوں کو ثبات بخشے گا -

اعتراض - یہ حدیث صحیح کے خلاف ہے جس میں ثبات سے مراد یہ بتائی گئی ہے کہ قبر میں جب مومن سے سوال ہوگا تو وہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ کہے گا -

(۹) - وَالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ (طور - ۱)

تفسیر - بیت معمور سے مراد مساجد ہیں -

اعتراض - یہ اس حدیث کے خلاف ہے جس میں تصریح کی گئی ہے کہ البیت المعمور ساتویں آسمان پر ہے"

ترجمان القرآن - یہ ایک نمونہ ہے اُن فضول، لایعنی اور لاطائل جھگڑوں کا جن میں ہمارے اکثر وبیشتر علماء دین نہ صرف خود اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں بلکہ عام مسلمانوں کے ذہن کو بھی اس بری طرح الجھا رہے ہیں کہ ان غریبوں کو دین کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی - ان لوگوں کی دنیا تنگ اور محدود ہے، اور اس تنگ دنیا میں بیٹھے ہوئے یہ سمجھ رہے ہیں کہ انکی اور ساری دنیا کی فلاح کا مدار بس اس قسم کے سوالات پر ہے کہ حضرت مریم کو گرمی کا میوہ جاڑے میں ملتا تھا یا نہیں، اور لوہا حضرت داؤد کے ہاتھ میں آتے ہی موم بن جاتا تھا یا نہیں - کاش کوئی صورت ایسی ہوتی کہ انہیں ان کے حجروں کی تنگ دنیا سے نکال کر خدا کی وسیع دنیا کا مشاہدہ کرایا جاتا اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ وہ حقیقی مسائل کون سے ہیں جن پر نوع انسانی کی فلاح وسعادت کا انحصار ہے، اور وہ مہمات امور کون سے ہیں جن پر قوموں کی قسمتیں بنتی اور بگڑتی ہیں -

سب سے بڑھکر افسوسناک امر یہ ہے کہ ان مسائل میں مغز پاشی کرنے والے وہ لوگ ہیں جو ہمارے دین کے عالم اور ملت اسلامیہ کے علمبردار کہلاتے ہیں۔ مسلمان ان کی طرف اسیلیے رجوع کرتے ہیں کہ ان کے پاس سے دین کا علم ملیگا۔ اور دنیا ان کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ یہ اس دین کے نمائندے ہیں جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ ایسی اہم ذمہ دارانہ پوزیشن پر متمکن ہو کر جب یہ اُس قسم کے مسائل پر زبان وقلم کا زور صرف کرتے ہیں جنکا ایک چھوٹا سا نمونہ اوپر کے سوال میں پیش کیا گیا ہے تو مسلمان اور غیر مسلم سب اس غلط فہمی میں پڑجاتے ہیں کہ شاید اسلام کے مہمات مسائل یہی کچھ ہونگے۔ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمگیر دائمی نبوت کے اتنے عظیم الشان منصب پر مقرر کر کے اسی لیے بھیجا ہوگا کہ آپ ان مسائل کا تصفیہ فرمائیں۔ اور یہ اسلام جو ساری دنیا کو راہ راست دکھانے اور دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ ور کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے، اسکے اہم ترین مسائل ——— ایسے اہم جن پر مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے ——— بس یہی ہونگے کہ یوسف علیہ السلام اور امرأة العزیز کے قضیہ میں فیصلہ کرنے والا بچہ تھا یا جوان، اور حضرت موسیٰ کو اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے توراۃ لکھ کر دی تھی یا نہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اگر یہی اسلام ہے جسکی نمائندگی اس طرح کی جارہی ہے تو دنیا کا دائرۂ اسلام میں آنا تو درکنار، خود مسلمانوں کا بھی اس دائرے میں رہنا مشکل ہے، کیونکہ ایک چھوٹے سے جاہل طبقہ کے سوا عامۃ الناس کو ان مسائل سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں اپنا وقت صرف کریں اور ان کے لیے لڑیں جھگڑیں۔

میں سائل کا شکرگذار ہوں کہ انہوں نے کتاب کے مصنف اور معترض گروہ کے نام ظاہر نہیں کیے۔ فریقین کی شخصیت سے بے خبر ہو کر جو رائے ظاہر کی جائیگی اس پر کسی کو یہ شبہ کرنیکا موقع نہیں مل سکتا کہ اس میں کسی کی جانبداری یا مخالفت کی گئی ہے۔ میں صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح کے اعتراضات اوپر کے سوال میں درج کیے گئے ہیں، ایسے اعتراضات کی بنیاد پر کسی مسلمان کی تکفیر کرنا یا ملحد اور دہریہ ٹھیرانا قطعاً ناجائز ہے، اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ دین کے علم سے بے بہرہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کفر، الحاد اور دہریت کے معنی بھی معلوم نہیں ہیں، ورنہ وہ ان الفاظ کو اس طرح بے جا استعمال نہ کرتے۔ کفر سے مراد یہ ہے کہ جو تعلیم و ہدایت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اس کا انکار، یا اس سے معارضہ کیا جائے۔ الحاد یہ ہے کہ آدمی حق سے روگردانی کر کے باطل کی طرف مائل ہو (اور حق و باطل کا معیار پھر وہی علم ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو)۔ دہریت یہ ہے کہ انسان خدا کا منکر ہو یا کائنات کے نظم ونسق میں خدا کی خدائی کو غیر موثر مانتا ہو۔ اب غور کیجیے کہ بعض آیات کی جو تفسیریں اوپر نقل کی گئی ہیں ان میں سے کس میں کفر یا الحاد یا دہریت ہے؟

(۱) پہلی آیت کی تفسیر صحیح ہے یا غلط، اس سے یہاں کچھ بحث نہیں۔ مان لیجیے کہ غلط ہے۔ مگر کیا ہر غلطی کفر یا الحاد یا دہریت ہی ہوتی ہے؟ مصنف نے صُرْهُنَّ اِلَيْكَ کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ لغت کے اعتبار سے درست ہے۔ بعض قدیم مفسرین نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے۔ پھر وہ دوسرے فقرے (ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا) کا وہی مفہوم بیان کر رہا ہے جو آیت کے الفاظ سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ کس طرح معجزۂ ابراہیمی کا منکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ تاہم اگر مان لیا جائے کہ وہ اس آیت کی ایسی تاویل کرتا ہے جو اس خاص واقعہ کے معجزہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتی تب بھی الحاد کا الزام ثابت نہیں ہوتا۔ الحاد صرف اس صورت میں ہوگا جبکہ نفس معجزہ کی حقیقت سے انکار کیا جائے۔ رہا فرداً فرداً ایک ایک معجزہ تو قرآن میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں اس امر میں اختلاف کی گنجائش ہے، اور اختلاف کیا بھی گیا ہے، کہ آیا انہیں معجزہ قرار دیا جائے یا معمولی فطری واقعات۔ لہٰذا اگر ایسے کسی موقع پر کوئی شخص آیت کی تاویل اس طرح کرتا ہو کہ ایک واقعہ معجزہ کے بجائے محض فطری واقعہ قرار پائے تو الحاد کا الزام لگانا درست نہیں۔ اسے محض غلطی کہا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسری آیت کی تفسیر بلاشبہ الفاظ قرآنی سے ہٹی ہوئی ہے۔ مگر اس کو بھی کفر کہنے کے بجائے غلطی کہنا چاہیے۔ کفر اس وقت ہوتا جب قرآن کے علی الرغم مصنف یہ کہتا کہ پہاڑ اور پرندے تسبیح نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے۔ ایسی کسی بات کا ارتکاب مصنف نے نہیں کیا ہے، بلکہ اس نے اپنی عقل کے مطابق آیت کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نوع کی تاویلات پر اگر لوگوں کی تکفیر کی جانے لگے تو کسی شخص کا بھی کفر کے الزام سے بچنا ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ قرآن میں بہت سی ایسی آیات متشابہات ہیں جن کا مفہوم مختلف لوگ اپنی اپنی عقل

سے مطابق مختلف طور پر متعین کرتے ہیں۔ پہاڑوں اور پرندوں کا تسبیح کرنا ایک ایسا امر ہے جس کی کیفیت خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اگر کوئی اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کے پاس بھی ویسی ہی دانہ دار تسبیحیں ہوتی ہیں جیسی ہمارے زہاد پھیرا کرتے ہیں، تو میں اسکی رائے کو غلط کہہ سکتا ہوں مگر اسکی تکفیر نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی دوسرا شخص اسکا مطلب یہ لیتا ہے کہ حکم الٰہی کے آگے انکا مسخر ہونا ہی انکی تسبیح ہے اور اس تسبیح کے عالم میں انکو دیکھ کر حضرت داؤد پر یاد الٰہی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی (جیسا کہ اس تفسیر کے مصنف کا خیال ہے) تو میں اسکی رائے سے بھی اختلاف کر سکتا ہوں، مگر اسکی تکفیر نہیں کر سکتا۔ میں خود اس آیت کی تاویل یوں کرتا ہوں کہ حضرت داؤد کو اللہ نے بہترین سُریلی اور بلند آواز عطا فرمائی تھی۔ اس آواز کے ساتھ جب وہ زبور پڑھتے تو وادیاں گونج اٹھتیں، چرند و پرند جمع ہو جاتے، اور تمام گرد و پیش کی چیزوں پر ایک مستی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس تفسیر کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ ابو موسیٰ[1] اشعری قرآن پڑھ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستہ چلتے چلتے انکی آواز سن کر ٹھیر گئے اور کچھ دیر لطف لینے کے بعد فرمایا لقد اوتی ھٰذا مزمارًا من مزامیر آل داؤد (اس شخص کو لحن داؤدی میں سے ایک حصہ ملا ہے)۔ یہ تاویل میرے ذوق اور بصیرت سے مطابقت رکھتی ہے۔ اگر کوئی اس کو پسند نہیں کرتا تو اسے غلط کہہ سکتا ہے مگر میری تکفیر نہیں کر سکتا۔

(۳) تیسری آیت کا جو مفہوم مصنف نے بیان کیا ہے وہ الفاظ قرآنی کے خلاف نہیں ہے۔ قرآن کے الفاظ صرف یہ ہیں کہ "ہم نے اسکے لیے لوہے کو نرم کر دیا"۔ رہا سلف کا یہ قول کہ "حضرت داؤد کے ہاتھ میں آتے ہی لوہا آٹے کی طرح نرم ہو جاتا تھا"، تو بلا شبہ یہ قول حسن بصری اور قتادہ اور اعمش وغیرہم سے منقول ہے، مگر یہ لوگ خدا کی طرف سے کب مبعوث ہوئے تھے کہ ان کے اقوال کو ترک کر دینے سے انسان کافر ہو جائے؟ قرآن میں تو کہیں اس مفہوم کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث اس معنی میں مروی ہے پھر یہ کیا غضب ہے کہ لوگوں کو قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن اور قتادہ اور اعمش پر بھی ایمان

[1] حضرت ابو موسیٰ بڑے خوش آواز شخص تھے۔ ابو عثمان نہدی بیان کرتے ہیں کہ میں نے عمر بھر کوئی آواز ابو موسیٰ کی آواز سے اچھی نہیں سنی۔

لانے کا پابند کیا جاتا ہے؟ اور جو شخص انکے اقوال کو چھوڑتا ہے اسے بھی ویسا ہی کافر ٹھیرایا جاتا ہے جیسا اُس شخص کو جو قرآن اور نبیؐ کے ارشاد سے انحراف کرے؟

(۴) اس آیت کی تفسیر پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ بھی اُتنا ہی لغو ہے جتنا آیت نمبر ۳ کی تفسیر پر ہے۔ آیت کے الفاظ صرف یہ کہتے ہیں کہ حضرت زکریاؑ جب کبھی حضرت مریم علیہا السلام کے پاس محراب میں جاتے تو ان کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے کا سامان موجود پاتے۔ اور جب حضرت مریم سے پوچھتے کہ یہ کہاں سے آیا؟ تو وہ جواب دیتیں کہ خدا کے پاس سے۔" اب رہا یہ امر کہ وہ کھانے کا سامان دراصل گرمی کا میوہ جاڑے میں اور جاڑے کا گرمی میں ہوتا تھا، تو یہ نہ قرآن میں مذکور ہے اور نہ کسی حدیث صحیح میں، بلکہ یہ قَتَادَہ اور عِکرِمَہ اور سعید بن جُبَیرَ اور ضحّاک وغیرہم کا بیان ہے۔ تو کیا اب ان لوگوں کی رائے سے اختلاف کرنے والے بھی کافر بنائے جائینگے؟ اگر ایسا ہے تو آپ امام مجاہد کے حق میں کیا فرماتے ہیں جنہوں نے مذکورۂ بالا بزرگوں سے اختلاف کرکے "رزق" کی تاویل علم سے کی اور کہا کہ حضرت مریم کے پاس صحیفے پائے جاتے تھے جن میں علم ہوتا تھا؟ اور اس حدیث کے متعلق کیا ارشاد ہے جو جابرؓ بن عبداللہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے ہاں بھوک کی حالت میں تشریف لے گئے اور کچھ کھانے کو طلب کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ واللہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ حضور واپس تشریف لے گئے۔ اتنے میں حضرت فاطمہ کی ایک ہمسائی نے دو روٹیاں اور کچھ گوشت بھیج دیا۔ حضرت فاطمہ نے فوراً اپنے بچوں میں سے ایک کو دوڑایا کہ حضور کو واپس بلا لائیں۔ جب حضور تشریف لائے تو حضرت فاطمہ نے کھانا پیش کیا۔ آپ نے پوچھا کہ بیٹی یہ کہاں سے آیا؟ حضرت فاطمہ نے عرض کیا یاابت ھو من عند اللہ (ابا جان، یہ اللہ کے ہاں سے آیا ہے)۔ اس پر حضور نے فرمایا بیٹی خدا کا شکر ہے جس نے تجھے سیدۃ نساء بنی اسرائیل (مریم علیہا السلام) کے مشابہ بنایا۔ ان کے پاس بھی جب خدا کی طرف سے رزق آتا اور ان سے پوچھا جاتا کہ یہ کہاں سے آیا ہے تو وہ کہتی تھیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔" اس حدیث کو حجت بنا کر اگر کوئی کہے کہ حضرت مریم کے پاس پردۂ غیب سے رزق نہیں اترتا تھا، بلکہ اللہ نے ان کے لیے ایسا سامان کر دیا

تھا کہ وہ بے سہارا اور بے وسیلہ ایک محراب میں بیٹھی ہوئی تھیں اور وقت پر کوئی نہ کوئی شخص ان کو کھانا پہنچا دیا کرتا تھا، تو کیا ایسی تاویل کرنے والے کو کافر ٹھیرایا جائیگا؟ پھر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ گرمی کا میوہ جاڑے میں اور جاڑے کا گرمی میں ملنا بجز خرق عادت کے اور کونسی خوبی اپنے اندر رکھتا ہے؟ اللہ نے جو میوہ جس موسم میں پیدا کیا ہے وہ اسی موسم کے لیے نعمت ہے، کیونکہ وہ اس موسم کی طبیعت کے لحاظ سے پیدا کیا گیا ہے۔ دوسرے موسم میں اس میوہ کا ملنا عجوبہ تو ہو سکتا ہے مگر نعمت نہیں۔

(۵) اس آیت کی تاویل میں امام رازی فرماتے ہیں:۔

واعلم انه ليس فی لفظ الاية ما يدل علی كيفية تلك الالواح وعلی كيفية تلك الكتابة فان ثبت ذلك التفصيل بدليل منفصل قوی وجب القول به و الا وجب السكوت عنه	معلوم ہونا چاہیے کہ اس آیت کے الفاظ سے واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ لوحیں کیسی تھیں اور اس کتابت کی کیفیت کیا تھی۔ اب اگر کسی دوسری قوی دلیل سے یہ تفصیل ثابت ہو تب تو اس کا قائل ہونا چاہیے ورنہ اس باب میں سکوت ہی مناسب ہے۔

کیا امام رازی کی بھی تکفیر کی جائیگی کہ انہوں نے بخاری کی حدیث مذکور کے ہوتے ہوئے کیفیت کتابت کی تفصیل کو غیر ثابت سمجھا ہے؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہو سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کے نزدیک کسی حدیث کے الفاظ یا اسناد مشتبہ ہوں اور اس بنا پر وہ اس کا قائل نہ ہو تو اسے قول رسول کا منکر ٹھیرا دیا جائے؟ اس نوعیت کے کفر سے علماء سلف میں سے کونسا عالم اور امام بچ سکتا ہے؟ چھوٹے لوگوں کو چھوڑیے۔ بڑے بڑے ائمہ سے جن کی امامت صدیوں سے دنیائے اسلام میں مسلم ہے، ایسے اقوال منقول ہیں جو بعض روایات کے خلاف پڑتے ہیں۔ کیا ان سب کو منکر فرمان رسول قرار دیا جائیگا؟

وہ حدیث جس سے معترضین نے استدلال کیا ہے بخاری میں چار جگہ آئی ہے اور چاروں جگہ اس کے الفاظ مختلف ہیں:۔

کتاب القدر میں طاؤس ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں اصطفاك اللّٰہ بکلامہ وخط لك بیدہ۔ خدا کا اپنے ہاتھ سے توراۃ لکھنا صرف اسی روایت میں بیان ہوا ہے۔

کتاب التوحید اور احادیث الانبیاء میں حمید بن عبدالرحمٰن ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں اصطفاك اللّٰہ برسالتہ وبکلامہ (یا برسالاتہ وبکلامہ) اِس روایت میں ہاتھ سے توراۃ لکھنے کا مضمون نہیں ہے۔

کتاب التفسیر میں محمد بن سیرین ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں اصطفاك اللّٰہ برسالتہ واصطفاك لنفسہ وانزل علیك التوراۃ۔ یہاں بھی ہاتھ سے توراۃ لکھنے کا مضمون نہیں ہے۔

امام مسلم نے کتاب القدر میں چار حدیثیں نقل کی ہیں جو سب حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں اور ان میں سے تین اس مضمون سے خالی ہیں۔ دوسری معتبر کتب حدیث میں بھی یہی حال ہے کہ اکثر روایات میں ایسی کوئی عبارت نہیں جو ہاتھ سے توراۃ لکھنے کی تصریح کرتی ہو۔ اس تقابل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اول تو یہ حدیث باللفظ نہیں بلکہ بالمعنی روایت ہوئی ہے، دوسرے امر مشکوک ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط لك بیدہ (یعنی اللہ نے توراۃ اپنے ہاتھ سے آپ کو لکھ کر دی تھی) کے الفاظ فرمائے تھے یا نہیں۔ پس انتہا درجہ کی بے احتیاطی بلکہ جرم ہے کہ ایسے ایک مشتبہ امر کی بنیاد پر کسی مسلمان کی تکفیر کی جائے۔

(۷) اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس کے قول کو حجت بنا کر مصنف کی تکفیر کی گئی ہے، حالانکہ خود حضرت ابن عباس سے تین مختلف قول منقول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ شاہد جس نے حضرت یوسف اور امرأۃ العزیز کے معاملہ میں فیصلہ دیا تھا، ذولحیہ (ڈاڑھی والا) تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ شاہ مصر کے مصاحبوں میں سے تھا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ "ایک بچہ تھا گہوارے میں"۔ اب کیوں نہ معترضین جرأت کرکے خود حضرت ابن عباس ہی کی تکفیر کر دیں؟ اور کیوں نہ ساتھ ہی مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ، محمد بن اسحاق سُدّی اور زید بن اسلم کو بھی لپیٹ لیں کیونکہ یہ سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ وہ بچہ نہ تھا بلکہ مرد تھا؟

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس بات کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی تھی کہ جس کا

ذکر تک ضروری نہ سمجھا اس کو اتنی اہمیت دی جائے کہ اگر کوئی شخص اسے نظر انداز کردے تو اسے منکرِ قرآن ٹھہرایا جائے۔ قرآن واقعات کی غیر ضروری تفصیلات کو عموماً چھوڑ دیتا ہے، اور صرف ان اہم اجزاء کو بیان کرتا ہے جو نفسِ مقصود سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر بعض مفسرین کا ذوق اس طرح کا ہے کہ وہ اُن غیر ضروری تفصیلات کا کھوج لگاتے ہیں جنھیں قرآن نے نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو چار پرندے لینے کا حکم دیا گیا۔ یہ واقعہ جس غرض کے لیے بیان کیا گیا ہے اس میں یہ تفصیل غیر ضروری تھی کہ وہ پرندے کون کون سے تھے۔ مگر بعض مفسرین نے معلوم نہیں کس جگہ سے پتہ چلایا کہ وہ پرندے مور اور کوّا اور کبوتر وغیرہ تھے۔ اسی طرح قرآن حضرت یوسف کے واقعہ میں صرف اتنا بیان کرتا ہے کہ ایک شاہد نے قرائن کی شہادت سے حضرت یوسف کی برأت ثابت کی۔ اس میں یہ سوال کہ شاہد کی عمر کیا تھی بالکل غیر اہم تھا اسلیے قرآن نے اسکا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مگر بعض مفسرین نے شاہد کی عمر کا کھوج لگانا بھی ضروری سمجھا۔ ایسی باتوں سے جس شخص کو دلچسپی ہو وہ مفسرین کے اقوال کو قبول کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ لیکن یہ کیا ظلم ہے کہ جو لوگ ان اقوال کو نظر انداز کردیں اور صرف انہی امور تک تفسیر کو محدود رکھیں جنھیں قرآن نے بیان کیا ہے تو انکی تکفیر کی جائے؟ اور پھر تکفیر بھی اس بنیاد پر کہ تم نے سلف کے قول سے انحراف کیا ہے؟ آخر معلوم تو ہو کہ یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے؟

(۷) ساتویں آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

"کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس ملائکہ آئیں یا تیرا رب (خود) آجائے یا تیرے رب کی بعض کھلی نشانیاں آجائیں؟ جس روز تیرے رب کی بعض کھلی نشانیاں آجائینگی اس روز تو کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان نفع نہ دیگا جو اس سے پہلے ایمان نہ لاچکا ہو یا جس نے اپنے ایمان میں کسی بھلائی (یعنی عمل صالح) کا اکتساب نہ کیا ہو۔"

خط کشیدہ فقرے میں جس دن کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد وہ دن بھی ہو سکتا ہے جب خدا کا

عذاب سر پر آجائے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا (المومن - ۹)
اور اس سے مراد موت کا وقت بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ان اللہ تعالیٰ یقبل توبۃ العبد
مالم یغرغر، یعنی جب جاں کنی شروع ہو جائے اور حلق میں گھونگرو بولنے لگے اس وقت اللہ تعالیٰ بندے
کی توبہ قبول نہیں کرتا۔ اور اس سے مراد وہ وقت بھی ہو سکتا ہے جب قیامت کی کھلی ہوئی علامات ظاہر ہونے
لگیں، جیسا کہ اُس حدیث میں مذکور ہوا ہے جس کا حوالہ معترضین نے دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان معانی
میں سے ایک معنی بیان کرتا ہے اور دوسرے معانی کی تکذیب نہیں کرتا تو آخر اسکی تکفیر کس بنا پر کی جاتی ہے؟
جبکہ قرآن کے الفاظ تینوں معنوں کے محتمل ہیں، اور ہر معنی کی تائید قرآن یا حدیث سے ہوتی ہے، تو ان تینوں
میں سے ایک معنی بیان کرنے والا آخر کس جرم کی پاداش میں کافر ہو جائیگا؟

(۸) آٹھویں آیت کے جو معنی مصنف نے بیان کیے ہیں وہ الفاظ قرآنی کے بالکل مطابق ہیں، اور
اس حدیث کے بھی خلاف نہیں ہیں جس کا حوالہ معترضین نے دیا ہے۔ وہ حدیث اس آیت کے صرف ایک
پہلو پر روشنی ڈالتی ہے، یعنی یہ کہ حیات اخروی کے دروازہ میں قدم رکھتے ہی اللہ تعالیٰ مومن کو کلمۂ توحید سے
کس طرح ثبات بخشے گا، سو مصنف اس کا منکر نہیں ہے، وہ بھی آخرت میں ثبات بخشے جانے کا قائل ہے
البتہ اگر معترضین اس حدیث کو حجت بنا کر دنیا کی زندگی میں کلمۂ توحید سے ثبات حاصل ہونے کا انکار کرتے
ہیں تو وہ خود قرآن کی تکذیب کے مجرم ہیں، کیونکہ قرآن فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الآخرۃ کہہ رہا ہے، اور
حدیث میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو فی الحیٰوۃ الدنیا کی تردید کرتا ہو۔

یہ سخت جہالت کی بات ہے کہ بعض آیات کی تفسیر میں جو احادیث یا آثار منقول ہیں ان کو حصر کے
معنی میں لے لیا جائے اور یہ گمان کر لیا جائے کہ ان آیات کا کوئی مفہوم اُس مفہوم کے سوا یا اُس مفہوم سے زائد
نہیں ہے جو ان احادیث یا آثار میں بیان ہوا ہے۔ جو لوگ تفسیروں میں کوئی حدیث یا اثر دیکھ کر سمجھ لیتے
ہیں کہ آیت کا مفہوم صرف اسی قدر ہے، اور اس سے زائد یا اس سے مختلف مفہوم بیان کرنے والے کو حدیث

یا اثر کا منکر قرار دیتے ہیں وہ دراصل سلف کے طریقہ سے ناواقف ہیں اور اپنے جہل کی کند چھری سے بندگان خدا کے ایمان کو ذبح کرتے ہیں۔ انہیں علامہ ابن القیم کے ان الفاظ کو غور سے پڑھنا چاہیے:

"ابن عباس اور دوسرے بزرگان سلف کا طریقہ یہ ہے کہ بسا اوقات وہ آیت کے معانی اور دلالات میں سے کسی ایک چیز کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ مگر ناواقف لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ آیت کا کوئی اور مفہوم اس معنی کے سوا نہیں ہے۔" (اعلام الموقعین جلد اول ص ۱۵۰)

(۹) البیت المعمور کی تفسیر پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ بھی اسی نوعیت کا ہے جیسا نمبر ۷ میں مذکور ہوا۔ حدیث میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ بیت المعمور آسمان میں ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بیت المعمور زمین میں نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آسمان میں بھی ہے۔ حصر کا پہلو اختیار کرنا محض ناواقفیت کی دلیل ہے۔ آیت کے الفاظ عام ہیں اور دوسرے معانی کا بھی احتمال رکھتے ہیں۔ ایک شخص بیت المعمور سے مراد بیت اللہ بھی لے سکتا ہے۔ پوری زمین کو بھی بیت المعمور قرار دے سکتا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ البیت کا الف لام تعریف جنس کے لیے ہے اور اس سے مراد ہر آباد جگہ ہے۔ یہ سب معانی اس مقصود سے مطابقت رکھتے ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے البیت المعمور کی قسم کھائی ہے۔ پھر آخر کس دلیل سے انسان پر دوسرے تمام معانی کا دروازہ بند کیا جا سکتا ہے؟

مزید براں یہ کتنی زیادتی ہے کہ جو شخص کسی حدیث کے بارے میں ساکت ہو اسے حدیث کا منکر یا مکذب ٹھیرا دیا جائے۔ کیا سکوت کے معنی صرف انکار اور تکذیب ہی کے ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے اس حدیث کا علم نہ ہو؟ اور اگر بالفرض وہ اسی لیے سکوت اختیار کرتا ہے کہ وہ اس حدیث کا قائل نہیں ہے تب بھی اس کی تکفیر کیسے کی جا سکتی ہے؟ تکفیر صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ وہ شخص حدیث کو صحیح مانے اور پھر یہ کہے کہ جو بات رسول اللہ صلعم سے ثابت ہے اس کو میں تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اگر وہ اس امر میں شک رکھتا ہو کہ یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں، اور اس بنا پر حدیث کو رد کرتا ہو تو اسے

کفر یا الحاد کا الزام کیسے دیا جا سکتا ہے؟

اس بحث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کفر، الحاد اور دہریت جن چیزوں کا نام ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اُن عبارات میں نہیں پائی جاتی جو زیر بحث تفسیر سے سائل نے نقل کی ہیں۔ اس کے مصنف کی بعض باتوں کو غلط کہا جا سکتا ہے، مگر کسی چیز کا غلط ہونا اور چیز ہے اور اس کا کفر یا دہریت یا الحاد ہونا اور چیز۔ جو شخص قواعد شرعیہ سے واقف ہو اور یہ جانتا ہو کہ ثبوت کفر کے لیے کن چیزوں کا متحقق ہونا ضروری ہے وہ ہرگز یہ جسارت نہیں کر سکتا کہ جہاں اپنے نزدیک کوئی بات غلط پائے وہاں کفر کا حکم لگا دے۔ مگر یہ مسلمانوں کی سخت بدقسمتی ہے کہ جو لوگ ان کے مقتدا بنے ہوئے ہیں ان میں سے بعض تو حقیقتہً قواعد شرعیہ سے ناواقف ہیں اور صرف حمل اسفار کی حد تک علم رکھتے ہیں، اور بعض ذی علم تو ہیں مگر خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں رکھتے، اس لیے انہوں نے اپنا یہ شیوہ بنا لیا ہے کہ جہاں کسی سے ناراض ہوئے، اور بلا تامل اس کے خلاف کفر کا حکم صادر کر دیا۔ یہ لوگ بے تکلف کفر و الحاد کے الفاظ کو "غلط" کے معنی میں بولتے ہیں، ہر وہ چیز جو ان کی رائے میں غلط ہے وہ یا تو کفر ہے یا الحاد یا دہریت۔ بہت ترحم کرینگے تو فسق اور گمراہی کا حکم لگا دینگے۔ اس سے کم وزن کا کوئی لفظ انکی لغت میں ہے ہی نہیں۔

جو لوگ ترجمان القرآن کی روش سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ میں اس قسم کے جھگڑوں سے ہمیشہ الگ رہتا ہوں۔ اپنے طریقہ سے ہٹ کر آج اس بحث میں چند صفحے سیاہ کرنے سے میرا مقصد اس خاص مقدمہ میں دخل دینا ہرگز نہیں ہے جسے سائل نے اپنے سوال میں پیش کیا ہے۔ کیونکہ ایسے مقدمات تو ہندوستان میں اس کثرت سے چھڑے ہوئے ہیں کہ انکا تصفیہ کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ میرا مقصد اس بحث سے صرف یہ ہے کہ اول تو میں ان علماء کے ضمیر سے اپیل کرنا چاہتا ہوں جو اس قسم کے جھگڑے مسلمانوں میں برپا کر کے اسلام کی طاقت کو نقصان پہنچاتے ہیں اور دنیا کی نگاہوں میں اپنے ساتھ اپنے دین کو بھی مضحکہ بناتے ہیں۔ اسکے ساتھ میں عام مسلمانوں کو بھی بتانا چاہتا ہوں کہ یہ مولوی صاحبان عام طور جن مسائل کو چھیڑ کر آپس میں لڑتے ہیں وہ کسقدر بے حقیقت ہیں اور ان میں الجھ کر اپنا وقت اور روپیہ برباد کرنا اور اپنی قومی طاقت کو ضائع کرنا کیسی حماقت ہے کہ دنیا میں بھی اس سے رسوائی ہو اور خدا بھی خوش نہ ہو۔

مطبوعات

مدینہ جوبلی نمبر یہ ضخیم نمبر اخبار "مدینہ" (بجنور) نے اپنی ۲۵ سالہ جوبلی کی یادگار میں نکالا ہے جو صوری اور معنوی دونوں طرح کے محاسن سے آراستہ ہے۔ اکثر مضامین مفید اور بلند پایہ ہیں۔ مضمون نگاروں میں ملک کے بعض مشاہیر اور علماء بھی شامل ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے ارشادات نہایت قیمتی اور خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کرنے کے قابل ہیں۔ بعض "مسلمان" سوشلسٹ صاحبان کے مضامین بھی درج کئے ہیں جن میں انہوں نے اپنے جدید مذہب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اور بعض مخالفین اشتراکیت کے مضامین بھی درج کیے گئے ہیں جو اشتراکیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر اشرف صاحب کا بھی ایک مضمون "سوشلزم کیا نہیں ہے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے تعریض و تضحیک کا غیر علمی انداز بحث اختیار کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے دوائر بحث و نظر الگ الگ ہیں لہٰذا ان دونوں کے تصادم یا تعارض کا خیال کرنا ہی سرے سے ایک لغو بات ہے۔ جہالت کے ساتھ ادعائے علم اور ادعائے علم کا آگے بڑھ کر تضحیک و تعریض بن جانا، ایک نہایت پر لطف مرکب بنا دیتا ہے، اور ہمارے فاضل ڈاکٹر کا یہ مضمون اس مرکب کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب سوشلزم کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہونگے، مگر اسلام کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔ انکا یہ مضمون خود ہی انکی ناواقفیت پر گواہ ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ سوشلزم ایک اجتماعی فلسفہ ہے جو سماج یا معاشرہ (سوسائٹی) کے مسائل سے بحث کرتا ہے اور اسکے بعد دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام اور سوشلزم کے دوائر بحث و نظر الگ ہیں، تو اس سے منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کا نہ کوئی اجتماعی فلسفہ ہے اور نہ وہ سماج یا معاشرہ کے مسائل سے بحث کرتا ہے۔ اس سے بڑھکر اسلام کے متعلق کسی شخص کی جہالت اور کیا ہو سکتی ہے؟ مگر اس جہالت کے باوجود وہ پوری عالمانہ شان اور عینی عالمانہ شان کے ساتھ جو مخاطبوں کو جاہل فرض کرکے تعریض پر اتر آتی ہے، فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ اسلام کا کسی جگہ سوشلزم سے تصادم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ مضمون غالباً ان علماء کو مرعوب کرنیکے لیے لکھا ہے جو بیچارے سوشلزم سے ناواقف ہیں۔ لیکن صاحب موصوف کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سوشلزم کو شائد ان سے کچھ زیادہ ہی جانتے ہیں اور اس کے ساتھ اسلام سے بھی واقف ہیں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

حصّہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں

ایک روپے میں ۵ نسخے		علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں ۵۰ نسخے	}	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں ۱۰۰ نسخے		

حصّہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

۲ روپے ۴ آنہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۵ نسخے	۱۱ روپے ۸ آنہ میں ۲۵ نسخے	کرایہ ریل
محصول ڈاک بذمہ خریدار	۲۲ روپے میں ۵۰ نسخے	بذمہ خریدار
	۴۰ روپے میں ۱۰۰ نسخے	

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اِسلامی جہاد کی حقیقت اِسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیمِ جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظامِ تمدن میں رُوحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے -

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصُول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اِس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصُول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اِس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اِسلام میں تلوار کا کیا حِصّہ ہے -

۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات -

۶- جنگ دُوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ -

۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد ۵ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے- اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے- مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے- اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصُولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں-

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مُطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہوسکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اِس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰/ محصولڈاک ۲/ خرچ وی پی ۳/

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

سوسائٹی و تصاویر پرنٹ پریس بل روڈ لاہور میں طبع ہوئی